اکتوبر 58

رجسٹر نمبر ایل ۵۳۲۰

جلد ۵۱ — عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۸ء	جلد ۵۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن۔ اچھرہ ملتان لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گزشتہ ترجمان القرآن میں اس دنیا اور اُس کے مال و متاع کے ساتھ ایک مومن و مسلم کے تعلق کی نوعیت کے سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ ایک مسلمان کے نزدیک حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے اور وہی اُس کا اصل ٹھکانہ ہے لیکن چونکہ اُس حیات جاودانی کا راستہ اس عارضی زندگی کی آزمائشوں ہی میں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان اُسے طے کرنے پر مجبور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دنیا اور اور اُس کے سارے احوال و اسباب عارضی اور ناپائیدار ہیں اور اس بنا پر وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اُن پر تکیہ کیا جاسکے تو پھر وہ کونسے ایسے سہارے ہیں جن کے بل پر ایک مسلمان اپنی حیاتِ مستعار کو گزار سکے۔ یہ سوال انسان کی فطرت کا اوّلین اور بنیادی سوال ہے اس لیے اس کی تاریخ بھی اتنی قدیم اور پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت کی زندگی۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کو اس سوال نے پریشان نہ کیا ہو اور اُس نے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس سوال کا جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کرسکتے ہیں اور نہ ہی تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ اسی کے ذریعے کفر کو اسلام سے، اطاعت کو بغاوت سے معصیت کو نیکی اور پرہیزگاری سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ اسی سوال کا جواب انسان کا انداز فکر اور اسلوبِ حیات متعین کرتا ہے۔ اس کی نوعیت پر ہی سیرت و کردار کے مختلف ڈھانچے تیار ہوتے ہیں اور افکار و تصورات کی صورت گری ہوتی ہے۔ انسان نے آج تک جتنے فلسفے گھڑے ہیں، جس قدر تہذیبوں کو جنم دیا ہے اور جتنے نظامہائے حیات قائم کیے ہیں ان سب میں یہی ایک سوال بنیاد کے طور پر کام دے رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معاشرت و معاملات

ہیں، اخلاق و اجتماع میں، سیاست و آئین میں، علم و فلسفہ میں، الغرض حیاتِ انسانی کے سارے مناظر و مظاہر میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی بنیادی سوال کے رُخِ زیبا کا عکس ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فرد یا قوم نے اس سوال کے جواب کا فلاں پہلو اختیار کیا ہے تو ہم اُس کی زندگی کے نقشہ کے تمام خانے از خود بھر سکتے ہیں یا اگر ہم کسی قسم کی زندگی یا تمدن کی خصوصیات پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ہم اس امر کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس نے اس سوال کے جواب کا کونسا پہلو اختیار کیا ہے۔

ایک غیر مسلم کے نزدیک چونکہ اصل زندگی یہی آب و گل کی زندگی ہے۔ اور آخرت کی زندگی محض اعتباری چیز ہے اس لیے وہ صرف اسی زندگی کے لیے جیتا ہے اور اسی کو مادی اعتبار سے بہتر اور پُرلطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی زندگی کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو معراجِ انسانیت تصور کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر وہ چیز بے وقعت ہوتی ہے جو اُس کے تحت میں نہ آسکے یا جس کی تصدیق مجرد حواسِ ظاہری سے نہ ہوتی ہو۔ وہ ہر اسی قوت اور طاقت کا یا تو سرے سے انکار کر دیتا ہے یا اُس کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو حواس سے بالاتر ہو اور اگر وہ کبھی کسی بالاتر ہستی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس کا یہ اقرار صرف زبان کی حد تک محدود ہوتا ہے، اُس کے دل و دماغ اور عملی زندگی پر اس ایمان کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اس طرح اُس کی زندگی کے حسی رجحان، اخلاق و اعمال کی حسی بنیاد میں قطعاً کوئی تزلزل واقع نہیں ہوتا۔ وہ صرف لذت و تمتع کے لیے دنیا میں جیتا ہے اور اسی آرزو میں مرتا ہے۔ ایرانی شاعر نے جس مقصد کو "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کہا ہے وہ اس شخص یا قوم کی غایت الغایات ہوتی ہے۔

جو فرد یا گروہ بھی اپنے دل و دماغ میں اس دنیا اور اس کے مال و متاع کے بارے

میں یہ تصورات رکھتا ہے وہ بالکل فطری طور پر ان مادی اسباب کو اس کائنات کی ہر چیز سے نہ صرف عزیز تر سمجھتا ہے بلکہ انہیں بہت بڑی قوت اور طاقت کا حامل بھی خیال کرتا ہے اور انہیں سہاروں پر زندگی بسر کرنے ہی میں وہ اپنی فلاح و کامرانی کا راز دیکھتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے انہیں مانے یا نہ مانے مگر دنیا کے یہ مادی اسباب ہی حقیقت میں اُس کے معبود ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے بل پر وہ زندگی گذارنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے متعلق مختلف مقامات پر بحث کی گئی ہے۔ سورۃ شعراء میں قوم عاد کے انداز زیست کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ	کیا تم ہر بلند مقام پر بلا ضرورت ایک یادگار عمارت
وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ	بناتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو جیسے کہ
(رکوع ۔ ۷)	تمہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

اسی طرح رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو جن لوگوں سے اپنی دعوت کے آغاز میں سابقہ پیش آیا اُن میں سے اکثر و بیشتر اسی مادہ پرستانہ تصور حیات کے علمبردار تھے، اُن کے افکار و اعمال اخلاق و اجتماع میں حسیت پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اصل اور حقیقی زندگی یہی مادی زندگی ہے، اس کے اسباب ہی زندگی کے سب سے بڑے اور مضبوط سہارے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی ایسی طاقت اور قوت نہیں جو اُن کی زندگی کے اس رشتہ کو کاٹ سکے۔ چنانچہ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے:۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	انہوں نے کہا کہ دنیا کی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں
نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ	اور زمانہ کے سوا ہم کو کوئی ہلاک کرنے والا نہیں۔

زندگی کے اس طرز فکر کے برعکس آئیے اب یہ دیکھیں کہ اسلام ہمیں کس سہارے پر جینے کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام جس طرح ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تم ابنائے دنیا بننے کی بجائے ابنائے آخرت بنو، بالکل اسی طرح اس نے ہمارے ذہن میں اس خیال کو بھی راسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم اگر اس دنیا میں جئیں تو صرف اُس ذات کے سہارے جئیں جسے کبھی فنا نہیں، جو ہمیشہ کے لیے رہنے والی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی تصریحات جا بجا ملتی ہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ۔ (الفرقان - ۵)

اور تو اس زندہ و جاوید ہستی پر بھروسا کر جسے فنا اور موت نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (تغابن - ۲)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (وہی اکیلا ہی مالک و معبود ہے) اور بس اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو توکل کرنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا فرماتے تھے۔

اللھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت۔ اللھم اعوذ لعزتک لا الٰہ الا انت ان تضلنی انت الحی الذی لا یموت والجن والانس یموتون۔

اے اللہ! میں نے تیرے سامنے سر جھکایا اور تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوا اور میں نے تیرے سہارے پر جھگڑا کیا۔ اے اللہ! میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں کہ سوا تیرے کوئی معبود نہیں اس سے کہ تو مجھے بھٹکنے دے۔ تو زندہ ہے نہ مرے گا۔ جن اور انسان سب فانی ہیں۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بڑے بلیغانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں کہ ہمیں اُس ذات پاک کے سہارے زندگی بسر کرنی چاہیے جسے موت نہیں چھو سکتی۔ آخر اس سے زیادہ بیوقوف انسان دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی ہی طرح کی فانی چیزوں پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے۔

توکل کے معاملے میں دوسری چیز جو ہمیں قرآن پاک کے مطالعہ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ توکل صرف اُسی ذات پر کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ قوی، طاقتور اور دنیا کی ہر چیز پر غالب ہے جس کے فیصلے سب فیصلوں پر حاوی ہیں اور جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (آل عمران)

پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکیگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

پھر اسی مضمون کو سورۂ انفال میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (رکوع ۸)

اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قوت اور طاقت کے ان خزانوں کے مالک ہونے کی وجہ سے کوئی اُن کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ اُس کی ذات سے زیادہ علم کس شخص کو حاصل ہے اور اس سے بڑھکر کون قوت و طاقت کا مالک ہے۔ اس لیے تمہیں ان لوگوں کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دینی

چاہیے اور جو بات سچی ہے اُسے بغیر کسی خوف کے صاف صاف بیان کر دینا چاہیے :

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ - (نمل - ٦)	بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں - اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دیگا، اور وہی غالب اور جاننے والا ہے تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے

اس کائنات کے خالق اور مالک پر بھروسہ اور اعتماد یوں تو ایمان کی جان ہے اور ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی صرف اسی ایک سہارے پر بسر کرنی چاہیے، لیکن اس توکل کی حقیقی قدر و قیمت اور اہمیت انسان کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب اُس کی زندگی پر آپنے اور مادی اسباب نہ صرف اُس کا ساتھ چھوڑ دیں بلکہ اُس کے جان لیوا بن جائیں۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جب ایک مسلمان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب قدرت خود دیکھتی ہے کہ اُسے اپنے خالق اور مالک پر کس قدر بھروسہ ہے اور دنیاوی اسباب پر کتنا اعتماد ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا : حَسْبُنَا اللّٰهُ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ہم کو بس اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جب مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ گزیں تھے تو مشرکین مکہ ہمارے سروں پر آگئے۔ میں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ان میں کا ایک بھی اپنے قدم کے نیچے دیکھے تو ہم کو دیکھ لیگا - آپ نے بڑے ہی سکون اور اعتماد کے ساتھ فرمایا :

مَا ظَنُّكَ يَا اَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ...	اے ابوبکر تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو،

ثَالِثُهُمَا　　جن کا تیسرا اللہ ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے توکل کے معنی بے عملی کے لیے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اللہ پر اعتماد اور بھروسے کا مطلب یہ ہے کہ اس کارگاہِ حیات میں کسی قسم کی جدوجہد نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی خلوت کدہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دیگا۔ توکل اور بھروسہ کا یہ تصور سراسر غلط اور باطل ہے۔ اسلام میں اس لفظ کے معنی ہیں کہ کسی کام کو پورے ارادہ و عزم، تدبیر اور کوشش کے ساتھ انجام دیا جائے لیکن اس کام کی تکمیل کے معاملہ میں نگاہ اسباب پہ رکھنے کی بجائے مسبب الاسباب پر رکھی جائے کیونکہ دنیا کی ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اس حقیقت کو اب ایک مثال سے سمجھیں۔ جب میں کسی کام کے کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں استعمال کرتا ہوں تو بظاہر میں ان اعضاء سے کام لیتا ہوں لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اعضاء کی کوئی حقیقت نہیں، ان کو سرگرمِ عمل کرنے والی چیز وہ قوت اور طاقت ہے جو میرے اندر موجود ہے۔ چنانچہ جب وہ قوت سلب ہو جاتی ہے تو یہ اعضا موجود ہونے کے باوجود بالکل عبث اور بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دنیاوی اسباب کا ہے۔ مال و اسباب کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے۔ جن سے اگر اللہ توفیق دے تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اگر اسے منظور نہ ہو تو یہ سب چیزیں نہ صرف بالکل بے فائدہ بن جاتیں بلکہ بسا اوقات انسان کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اُس شخص سے زیادہ بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے جو قوت و طاقت کے اصل منبع اور مبدا کو چھوڑ کر محض آلات کو اصل اور حقیقی قوت سمجھنے لگے؟

تفہیم القرآن

الشعراء

(۴)

——— (اس روز) جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی، اور دوزخ بہکے ہوتے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی[۲] اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟ پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ، اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے[۳]۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے کہ "خدا کی قسم، ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو

---

[۱] یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا جز نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس کا مضمون صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بات اِس گزارش پر ختم ہوگئی کہ "خدایا میرے باپ کو سزا دیکر قیامت کے روز مجھے رسوا نہ کیجیو، اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ اس روز مال و اولاد کسی کے کام نہیں آسکتی، کام آسکتا ہے تو صرف قلب سلیم"۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس روز گمراہ لوگ کس انجام سے دوچار ہونگے۔

[۲] یعنی ایک طرف متقی لوگ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ دیکھ رہے ہونگے کہ کیسی نعمتوں سے لبریز جگہ ہے جہاں اللہ کے فضل سے ہم جانے والے ہیں۔ اور دوسری طرف گمراہ لوگ ابھی میدانِ حشر ہی میں ہونگے کہ ان کے سامنے اُس جہنم کا ہولناک منظر پیش کر دیا جائے گا جس میں انہیں جانا ہے۔

[۳] اصل میں لفظ کُبْکِبُوْا فرمایا گیا ہے جس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ ایک کے اوپر ایک دھکیل دیا جائے گا، دوسرے یہ کہ وہ قعرِ جہنم تک لڑھکتے چلے جائیں گے۔

رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا[۷۴]۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے[۷۵] اور نہ کوئی جگری دوست[۷۶]۔ کاش ہمیں

[۷۴] یہ پیروؤں اور معتقدوں کی طرف سے اُن لوگوں کی تواضع ہو رہی ہو گی جنہیں یہ لوگ دنیا میں بزرگ، پیشوا اور رہنما مانتے رہے تھے، جن کے ہاتھ پاؤں چومے جاتے تھے، جن کے قول و عمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزرانی جاتی تھیں۔ آخرت میں جاکر جب حقیقت کھلیگی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو جائیگا کہ آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھہرائیں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ عالمِ آخرت کا یہ عبرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا:-

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ (رکوع ۴)

ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائیگا۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اب انہیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔ رب فرمائے گا سب ہی کے لیے دہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔

سورۂ حٰم السجدہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذَيْنِ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ۔ (رکوع ۴)

اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے پروردگار اُن جنوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تاکہ ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں اور وہ پست و ذلیل ہو کر رہیں۔

ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں؟"

یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے شہ مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ ع۵

یہی مضمون سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا، رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (رکوع ۸)

اور وہ کہیں گے اے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اے رب ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔

ھے یعنی جنہیں ہم دنیا میں سفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا پار ہے، ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کے لیے زبان کھولنے والا نہیں ہے۔

لہ یعنی کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ہمارا غم خوار اور ہمارے لیے کڑھنے والا ہو، چاہے ہم کو چھڑا نہ سکے مگر کم از کم اسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی ہی ہو۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ آخرت میں دوستیاں صرف اہلِ ایمان ہی کی باقی رہ جائیں گی، رہے گمراہ لوگ، تو وہ دنیا میں چاہے کیسے ہی جگری دوست رہے ہوں وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہونگے، ایک دوسرے کو مجرم ٹھہرائیں گے اور اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے کر ہر ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے کی کوشش کریگا۔ اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (الزخرف۔ رکوع ۶) "دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہونگے مگر متقین کی دوستیاں قائم رہیں گی"۔

ے اس تمنا کا جواب بھی قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ۔ (الانعام۔ رکوع ۶) "اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں جس سے انہیں منع کیا گیا ہے"۔ رہا یہ سوال کہ انہیں واپسی کا موقع کیوں نہ دیا جائیگا، اس کے وجوہ پر مفصل بحث ہم سورۂ مومنون حاشیہ نمبر ۹۱ میں کر چکے ہیں۔

قومِ[۹] نوحؑ نے رسولوں کو جھٹلایا[۱۰]۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا تھا[۱۱]، کیا

۸؎ حضرت ابراہیمؑ کے اس قصے میں نشانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ مشرکین عرب اور بالخصوص قریش کے لوگ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے ہیں مگر دوسری طرف اسی شرک میں مبتلا ہیں جس کے خلاف جدوجہد کرتے اُن کی عمر بیت گئی تھی اور ان کے لائے ہوئے دین کی دعوت آج جو نبی پیش کر رہا ہے اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے ہیں جو حضرت ابراہیم کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تو شرک کے دشمن اور دعوتِ توحید کے علمبردار تھے، یہ خود بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرتِ ممدوح مشرک نہ تھے، مگر پھر بھی یہ اپنی ضد پر قائم ہیں۔ دوسرا پہلو اس قصہ میں نشانی کا یہ ہے کہ قومِ ابراہیم دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہُوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ و اسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہُوا۔ قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار معذب قوموں ہی میں کیا گیا ہے: أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ (التوبہ۔ رکوع ۹)۔

۹؎ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۰ تا ۴۴۔ ۲۹۹ تا ۳۰۱۔ ۳۴۳ تا ۳۴۴۔ جلد سوم صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۳۔ ۲۷۳ تا ۲۷۶۔ اس کے علاوہ قصۂ نوح علیہ السلام کی تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی پیشِ نظر رہیں: الفرقان رکوع ۴۔ العنکبوت رکوع ۲۔ الصّٰفّٰت رکوع ۳۔ القمر رکوع ۱۔ سورۂ نوح مکمل۔

۱۰؎ اگرچہ انہوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا، لیکن چونکہ رسول کی تکذیب درحقیقت اس دعوت اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لیکر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس لیے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کر دے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے۔ یہ ایک بڑی اہم اصولی حقیقت ہے جسے قرآن میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی

تم ڈرتے نہیں ہو؟[۱] میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۲]، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت

کافر ٹھیرائے گئے ہیں جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہوں، باقی تمام انبیاء کو مانتے ہوں۔ اس لیے کہ جو شخص اصل پیغامِ رسالت کا ماننے والا ہے وہ تو لازماً ہر رسول کو مانے گا۔ مگر جو شخص کسی رسول کا انکار کرتا ہے وہ اگر دوسرے رسولوں کو مانتا بھی ہے تو کسی عصبیت یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر مانتا ہے نفسِ پیغامِ رسالت کو نہیں مانتا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اسے مان لے اور وہی دوسرا پیش کرے تو یہ اس کا انکار کر دے۔

[۱] دوسرے مقامات پر حضرت نوحؑ کا اپنی قوم سے ابتدائی خطاب ان الفاظ میں آیا ہے۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (المومنون۔ رکوع ۲) "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (نوح۔۱) "اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" اس لیے یہاں حضرت نوحؑ کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف نہیں بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہو گئے ہو؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس باغیانہ روش کا انجام کیا ہو گا؟

دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویے کی بدانجامی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہِ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

[۲] اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر یا کم و بیش کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راستباز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تمہیں یاور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں

کرو۔ ۳۱ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے

جیسا دنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔

۳۱ یعنی میرے رسولِ امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مُطاعوں کی اطاعت چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو اور جو احکام میں تمہیں دیتا ہوں اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کردو، کیونکہ میں خداوندِ عالم کی مرضی کا نمائندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہے وہ اس کی صداقت تسلیم کرلیں اور اسے رسولِ برحق مان لیں۔ بلکہ اس کو خدا کا سچا رسول ماننتے ہی آپ سے آپ یہ بھی لازم آجاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑ کر صرف اسی کے لائے ہوئے قانون کا اتباع کیا جائے۔ رسول کو رسول نہ ماننا، یا رسول مان کر اس کی اطاعت نہ کرنا، دونوں صورتیں دراصل خدا سے بغاوت کی ہم معنی ہیں اور دونوں کا نتیجہ خدا کے غضب میں گرفتار ہونا ہے۔ اسی لیے ایمان اور اطاعت کے مطالبے سے پہلے "اللہ سے ڈرو" کا تنبیہی فقرہ ارشاد فرمایا گیا تاکہ ہر مخاطب اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ رسول کی رسالت تسلیم نہ کرنے یا اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

۳۲ یہ اپنی صداقت پر حضرت نوحؑ کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ دعوائے نبوت سے پہلے میری ساری زندگی تمہارے درمیان گزری ہے اور آج تک تم مجھے ایک امین آدمی کی حیثیت سے جانتے رہے ہو۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں، تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشان دہی نہیں کرسکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو یا جس کے حصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقے سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوتِ حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں صرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں، تو تمہیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، ایمانداری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلقِ خدا کی فلاح دیکھتا ہوں وہی پیش کر رہا ہوں، کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ

پس تم اللہ سے ڈرو اور دبے کھٹکے[۵۱] میری اطاعت کرو"۔ انہوں نے جواب دیا "کیا ہم تجھے گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔

یہ دونوں دلیلیں اُن اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآن مجید نے بار بار انبیاء علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو شخص ایک معاشرے میں برسوں زندگی بسر کر چکا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ ہر معاملہ میں اسے سچا اور راستباز آدمی پایا ہو، اس کے متعلق کوئی غیر متعصب آدمی مشکل ہی سے یہ شک کر سکتا ہے کہ وہ یکایک خدا کے نام سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر اُتر آئیگا کہ اسے نبی نہ بنایا گیا ہو اور وہ کہے کہ خدا نے مجھے نبی بنایا ہے۔ پھر دوسری اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسا سفید جھوٹ کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تو نہیں گھڑا کرتا۔ لامحالہ کوئی نفسانی غرض ہی اس فریب کاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنی اغراض کے لیے اس طرح کی فریب کاری کرتا ہے تو اخفا کی تمام کوششوں کے باوجود اُس کے آثار نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ اسے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں جن کے گھناؤنے پہلو گردوپیش کے معاشرے میں چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ اور مزید براں وہ اپنی پیری کی دکان چمکا کر کچھ نہ کچھ اپنا بھلا کرتا نظر آتا ہے۔ نذرانے وصول کیے جاتے ہیں، لنگر جاری ہوتے ہیں، جائدادیں بنتی ہیں، زیور گھڑے جاتے ہیں، اور فقیری کا آستانہ دیکھتے دیکھتے شاہی دربار بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے برعکس نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی ذاتی زندگی ایسے فضائلِ اخلاق سے لبریز نظر آئے کہ اس میں کہیں ڈھونڈے سے بھی کسی فریب کارانہ ہتھکنڈے کا نشان نہ مل سکے، اور اس کام سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا تو درکنار، وہ اپنا سب کچھ اسی خدمتِ بے مزد کی نذر کر دے، وہاں جھوٹ کا شبہ کرنا کسی معقول انسان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ کوئی شخص جو عقل بھی رکھتا ہو اور بے انصاف بھی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آخر ایک اچھا بھلا آدمی، جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، کیوں بلاوجہ ایک جھوٹا دعویٰ لیکر اٹھے جبکہ اسے کوئی فائدہ اس جھوٹ سے نہ ہو بلکہ وہ اُلٹا اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی ساری قوتیں اور محنتیں اس کام میں کھپا رہا ہو اور بدلے میں دنیا بھر کی دشمنی مول لے رہا ہو۔ ذاتی مفاد کی قربانی آدمی کے مخلص ہونے کی سب سے زیادہ نمایاں

مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟[۷۶] نوح نے کہا "میں کیا جانوں

دلیل ہوتی ہے۔ یہ قربانی کرتے جس کو سالوں بیت جائیں اسے بدنیت یا خود غرض سمجھنا خود اُس شخص کی اپنی بدنیتی
کا ثبوت ہوتا ہے جو ایسے آدمی پر یہ الزام لگائے۔

۷۵ اس فقرے کی تکرار بے وجہ نہیں ہے۔ پہلے یہ ایک اور مناسبت سے فرمایا گیا تھا اور یہاں ایک
دوسری مناسبت سے اس کو دُہرایا گیا ہے۔ اوپر اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ سے فَاتَّقُوا اللّٰہَ کے فقرے کی
مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، جس کی صفتِ امانت سے تم لوگ
خود بھی واقف ہو، اُسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ سے
اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کام
کر رہا ہے اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اِس بات کو اتنا زور دیکر بیان کرنے کی وجہ یہ
تھی کہ قوم کے سردار حضرت نوحؑ کی مخلصانہ دعوتِ حق میں کیڑے ڈالنے کے لیے اُن پر یہ الزام لگاتے تھے
کہ یہ شخص دراصل یہ ساری دوڑ دھوپ اپنی بڑائی کے لیے کر رہا ہے: یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْکُمْ (المومنون
رکوع ۲) "یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔"

۷۶ یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوحؑ کو دعوتِ حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شیوخ اور اشراف
تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے: فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ
قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ
وَمَا نَرٰى لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ (ہود، رکوع ۳) "اُس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہمیں تو تم اس
کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف اُن
لوگوں نے بے سمجھے بوجھے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے
جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔" اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر
غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے
طبقوں کے بااثر اور خوشحال لوگ، تو وہ اُن کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح

کہ ان کے عمل کیسے ہیں، ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔ ؎

کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ حضرت نوحؑ کے خلاف پیش کرتے تھے ان میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ اگر نوح کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء، علماء، مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن اُن میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ اِن بے شعور اور کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں؟

بعینہٖ یہی بات قریش کے کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرو یا تو غلام اور غریب لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابو سفیان نے ہرقل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ تبعہ منا الضعفاء والمساکین (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے)۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفارِ مکہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا، وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف۔ رکوع ۳) "وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا"۔

؎ یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اُن کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں، اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی، نہ ان کا

میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا آدمی ہوں۔ۃ ۲۱ انہوں نے کہا "اے نوح، اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے

اعتقاد لائق اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔ حضرت نوحؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اُس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے، میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔

ۃ ۲۱ یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوحؑ کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے نوحؑ، کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اراذل اور سفہاء میں شمار کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں؟ حضرت نوحؑ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے، اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پہ آئے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کے رستے چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں "کمین" ہوں تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہیگا۔[19] نوح نے دعا کی "اے میرے رب میری قوم نے

ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان چل رہا تھا اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جارہی ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلال اور عمار اور صہیب جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف اِدھر کا رُخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دو ٹوک ہدایت یہ دے دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیئے جا سکتے:

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ، كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (عبس)

اے محمدؐ، جس نے بے نیازی برتی تم اس کے پیچھے پڑتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے تم اس سے بے رخی برتتے ہو، ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ۔

نہ دور پھینکو ان لوگوں کو جو شب و روز اپنے رب کو پکارتے ہیں محض اس کی خوشنودی کی خاطر۔ ان کا کوئی حساب تمہارے ذمہ نہیں اور نہ تمہارا کوئی حساب ان کے ذمہ ہے، اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ ہم نے تو

مجھے جھٹلا دیا۔ اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا أَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۔ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۔ (الانعام ۔ رکوع ۶)	اس طرح اِن لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ کہیں "کیا ہمارے درمیان بس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے"۔ ہاں، کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا؟

۹ اصل الفاظ ہیں لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی، جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے اِن الفاظ کے یہ دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔

ننا یعنی آخری اور قطعی طور پر جھٹلا دیا ہے جس کے بعد اب کسی تصدیق و ایمان کی امید باقی نہیں رہی ظاہر کلام سے کوئی شخص اس شبہ میں نہ پڑے کہ بس پیغمبر اور سردارانِ قوم کے درمیان اوپر کی گفتگو ہوئی اور ان کی طرف سے پہلی ہی تکذیب کے بعد پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حضور رپورٹ پیش کر دی کہ یہ میری نبوت نہیں مانتے، اب آپ میرے اور ان کے مقدمہ کا فیصلہ فرما دیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اُس طویل کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کشمکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک ممتد رہا ہے۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (رکوع ۲)۔ حضرت نوحؑ نے اس زمانہ میں پشت در پشت اُن کے اجتماعی طرزِ عمل کو دیکھ کر نہ صرف یہ اندازہ فرما لیا کہ ان کے اندر قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آئندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایماندار آدمیوں کے اٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح رکوع ۲) "اے رب اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا

مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے[۲۱]" آخر کار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں
کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا[۲۲] اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔
یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور
حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع ع
عاد نے رسولوں کو جھٹلایا[۲۳]۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی ہودؑ نے ان سے کہا تھا "کیا

فاجر اور سخت منکرِ حق ہو گا"۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی اِس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علمِ کامل و شامل کی بنا پر فرمایا لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (ہود۔ رکوع ۴)، "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے"۔

۲۱؎ یعنی صرف یہی فیصلہ نہ کر دے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون، بلکہ وہ فیصلہ اس شکل میں نافذ فرما کہ باطل پرست تباہ کر دیئے جائیں اور حق پرست بچا لیے جائیں۔ یہ الفاظ کہ "مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو بچا لے" خود بخود اپنے اندر یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں پر عذاب نازل کر اور انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دے۔

۲۲؎ "بھری ہوئی کشتی" سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی ایمان لانے والے انسانوں اور ان تمام جانوروں سے بھر گئی تھی جن کا ایک ایک جوڑا ساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ ہود، آیت ۴۰۔

۲۳؎ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۴ تا ۴۷ - ۳۴۵ تا ۳۴۹۔ مزید براں اس قصے کی تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسبِ ذیل مقامات بھی نگاہ میں رہیں: حٰم السجدہ رکوع ۲۔ الاحقاف رکوع ۳۔ الذاریات رکوع ۲۔ القمر رکوع ۱۔ الحاقہ رکوع ۱۔ الفجر۔

اس قوم کے متعلق قرآنِ مجید میں جو معلومات ہم کو دی گئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:
قومِ نوحؑ کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی:۔

تم ڈرتے نہیں ؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ ۔ (الاعراف۔ رکوع ۹)
یاد کرو (اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ) نوح کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے:

وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (الاعراف)
اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔

اپنے دور میں یہ بے نظیر قوم تھی، کوئی دوسری قوم اس کی ٹکر کی نہ تھی:

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر)
جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

اس کا تمدن بڑا شاندار تھا، اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی:۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (الفجر)
تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ؟

اس مادی ترقی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبر بنا دیا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا:

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حم السجدہ۔ رکوع ۲)
رہے عاد تو انہوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔

ان کا سیاسی نظام جبر و ظلم پر قائم تھا:

وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہود۔ رکوع ۵)
اور انہوں نے ہر جبار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف ایک اللہ کی ہونی چاہیے:

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَ
انہوں نے (ہود سے) کہا کیا تو ہمارے پاس

اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو[۲۴] اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔[۲۵]

نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۔ (الاعراف) — اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور اُن کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

اِن خصوصیات کو نظر میں رکھنے سے حضرت ہودؑ کی وہ تقریرِ دعوت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے جو یہاں نقل کی گئی ہے۔

۲۴ یعنی محض اپنی عظمت و خوشحالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسی عالیشان عمارتیں تعمیر کرتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں، جن کی کوئی حاجت نہیں، جن کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہیں کہ وہ بس تمہاری دولت و شوکت کی نمود کے لیے ایک نشانی کے طور پر کھڑی رہیں۔

۲۵ یعنی تمہاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں، مگر ان کو شاندار، مزین اور مستحکم بنانے میں تم اس طرح اپنی دولت، محنت اور قابلیتیں صرف کرتے ہو جیسے دنیا میں ہمیشہ رہنے کا سامان کر رہے ہو، جیسے تمہاری زندگی کا مقصد بس یہیں کے عیش کا اہتمام کرنا ہے اور اس کے ماوراء کوئی چیز نہیں ہے جس کی تمہیں فکر ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ بلاضرورت یا ضرورت سے زیادہ شاندار عمارتیں بنانا کوئی منفرد فعل نہیں ہے جس کا ظہور کسی قوم میں اس طرح ہو سکتا ہو کہ اس کی اور سب چیزیں تو ٹھیک ہوں اور بس یہی ایک کام وہ غلط کرتی ہو۔ یہ صورتِ حال تو ایک قوم میں رونما ہی اس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف اس میں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کے اندر نفس پرستی و مادہ پرستی کی شدت بڑھتے بڑھتے جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ حالت جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا سارا ہی نظامِ تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی تعمیرات

اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو۔[۲۶] پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے، اولادیں دیں، باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔" انہوں نے جواب دیا "تو نصیحت کر یا نہ کر، ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں،[۲۷]

پر جو گرفت کی اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ ان کے نزدیک صرف یہ عمارتیں ہی بجائے خود قابلِ اعتراض تھیں بلکہ دراصل وہ بحیثیت مجموعی ان کے فسادِ تمدن و تہذیب پر گرفت کر رہے تھے اور ان عمارتوں کا ذکر انہوں نے اس حیثیت سے کیا تھا کہ سارے ملک میں ہر طرف یہ بڑے بڑے چھوڑے اس فساد کی نمایاں ترین علامت کے طور پر ابھرے نظر آتے تھے۔

۲۶؎ یعنی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں تو تم اس قدر غلو کر گئے ہو کہ رہنے کے لیے تم کو مکان نہیں محل اور قصر درکار ہیں، اور ان سے بھی جب تمہاری تسکین نہیں ہوتی تو بلا ضرورت عالی شان عمارتیں بنا ڈالتے ہو جن کا کوئی فائدہ اظہارِ قوت و ثروت کے سوا نہیں ہوتا۔ لیکن تمہارا معیارِ انسانیت اتنا گرا ہوا ہے کہ کمزوروں کے لیے تمہارے دلوں میں کوئی رحم نہیں، غریبوں کے لیے تمہاری سرزمین میں کوئی انصاف نہیں، گردوپیش کی ضعیف قومیں ہوں یا خود اپنے ملک کے پست طبقات، سب تمہارے جبر و ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور کوئی تمہاری چیرہ دستیوں سے بچا نہیں رہ گیا ہے۔

۲۷؎ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ آج کوئی نئی چیز نہیں ہے، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ان کا دین تھا، یہی ان کا تمدن تھا اور ایسے ہی ان کے اخلاق اور معاملات تھے۔ کونسی آفت اُن پر ٹوٹ پڑی تھی کہ اب ہم اس کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ کریں۔ اس طرزِ زندگی میں کوئی خرابی ہوتی تو پہلے ہی وہ عذاب آ چکا ہوتا جس سے تم ڈراتے ہو۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو باتیں تم کر رہے ہو ایسی ہی باتیں پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں گھارنے والے کرتے رہے ہیں، مگر دنیا کی گاڑی جس طرح چل رہی تھی اسی طرح چلے جا رہی ہے، تم جیسے لوگوں کی باتیں نہ ماننے کا یہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوا کہ یہ گاڑی کسی صدمہ سے دوچار ہو کر الٹ گئی ہوتی۔

اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں" آخر کار انہوں نے جھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۸۲؎

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ۔ ع

۸۲؎ اس قوم کے ہلاک ہونے کی جو تفصیل قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچانک زور کی آن ی اٹھی یہ ہوگئے۔ دور سے اس کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھ کر سمجھے کہ گھٹا چھائی ہے۔ خوشیاں منانے لگے کہ اب خوب بارش ہوگی۔ مگر وہ تھا خدا کا عذاب۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس نے ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی گرمی و خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ طوفان اس وقت تک نہ تھما جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک متنفس ختم نہ ہو گیا۔ بس ان کی بستیوں کے کھنڈر ہی ان کے انجام کی داستان سنانے کے لیے کھڑے رہ گئے۔

ایک ضروری تصریح

(از جناب ایس۔ اے رحمان صاحب۔ جج سپریم کورٹ آف پاکستان)

(ترجمان القرآن جلد ۵۰ عدد ۱، اپریل ۱۹۵۸ء کے ادارتی صفحات میں ہم نے بعض اصحاب کے خیالات پر بغیر اُن کے اسمائے گرامی ظاہر کیے بحث کی تھی۔ اُن حضرات میں سے ایک قابلِ احترام شخصیت جناب ایس۔ اے۔ رحمان صاحب نے ہمیں ایک طویل نوازش نامہ ارسال فرمایا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے اُن کے افکار کی غلط ترجمانی کی ہے اور اُن کی طرف وہ باتیں منسوب کی ہیں جو انھوں نے فی الواقع نہیں کہی تھیں۔ ہم ذیل میں اُن کا وہ نوازش نامہ من وعن درج کرتے ہیں تاکہ اگر کوئی غلط فہمی ہم نے پھیلائی تھی تو وہ دور ہوسکے۔ اس کے بعد ہم کچھ مزید گزارشات بھی پیش کر رہے ہیں تاکہ ہماری پوزیشن بھی واضح ہو جائے۔ (ادارہ)

مکرمی، سلامِ مسنون۔ حال ہی میں میرے ایک کرمفرما نے میری توجہ آپ کے رسالہ ترجمان القرآن کی جلد ۵۰ شمارہ ۱ بابت ماہ رجب مطابق اپریل ۵۸ء کی طرف دلائی ہے جس میں میری ایک تقریر کے حوالہ سے میرے مزعومہ خیالات پر خردہ گیری کی گئی ہے۔ یہ تنقید و تنقیص "اشارات" کے عنوان کے تحت ادارہ کی جانب سے پیش کی گئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں لکھنے والے کون صاحب ہیں۔ مجھے آپ کے رسالہ کے خصوصی دینی یا سیاسی نظریات سے کوئی تعرض نہیں اور نہ ہی اس خط کا مقصد کسی بحث میں الجھنا ہے۔ لیکن چونکہ ایک دینی معاملہ میں بادی النظر میں دانستہ طور پر میرے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے مجھے حق پہنچتا ہے کہ اس پر صدائے احتجاج بلند کروں۔

"اشارات" کے پہلے تین صفحوں میں "ملحدین و منافقین کی تاویل بازیوں اور فتنہ آرائیوں" کے

جاذبِ نظر آغاز یہ کے بعد صاحبِ تحریر نے "پاکستان کے تجدد پسند اصحاب" پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حضرات ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق زبردستی غیر حقیقی مسائل کو فتنوں کی شکل میں پیدا کر رہے ہیں اور اس طرح سے اسلام سے کھلم کھلا بغاوت کرنے کی بجائے حصارِ اسلام کو چوہوں کی طرح اندر سے نقب لگا رہے ہیں۔ صاحبِ تحریر کی رائے میں وہ سوالات جو اس قماش کے حضرات پیش کر رہے ہیں کسی ایسے شخص کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو، بلکہ وہ ایسے ذہنوں کی پیداوار ہیں جن کا اسلام سے کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ ان اصحاب کو "دون ہمت، کمزور، بزدل" کے خطابات سے بھی نوازا گیا ہے۔ یہاں تک خیر "منفر تخیل" کی مدح سرائی ہے لیکن اس کے بعد فاضل صاحبِ تحریر شاعرانہ گریز کرتے ہوئے اس بندہ ہیچمیرز وہیچمدان کی نسبت یوں رقمطراز ہوئے ہیں:۔

"ان صفحات میں ہم آج اسی مشرب کے ایک گل سرسبد کے خیالات پیش کرتے ہیں جن سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کس حکمت اور دانائی کے ساتھ اسلام کے اندر رخنے پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔" پھر ایک فقرہ کے بعد میری تقریر کا ایک مزعومہ اقتباس درج کیا گیا ہے اور بدیہی طور پر یہ تاثر پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ یہ اقتباس بعینہٖ اُن الفاظ پر مشتمل ہے جو مقرر نے استعمال کیے تھے۔ اس اقتباس کے تجزیہ کے بعد بقولِ اشارات نگار مفصلہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:۔

(ا) قرآن نے کوئی چیز تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی بلکہ چند اصولی باتیں بیان کر دی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں تفکر و تدبر کی دعوت دیکر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جو چاہیں اصول اور نظریے وضع کریں (ب) جس معاملے میں قرآن نے ہمیں کچھ اصول دیئے ہیں اس میں تو ہمیں اُن کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اس باب میں احکامِ الٰہی کی جو تعبیر و توجیہ ہم کرنا چاہیں اس کا ہمیں پورا پورا اختیار حاصل ہے باقی رہے زندگی کے وہ معاملات جن کے بارے میں قرآن نے کوئی واضح حکم نہیں دیا اور جن کا تناسب اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے، ہمیں صرف اپنے تفکر و تدبر پر اعتماد کرنا چاہیے۔

(ج) چونکہ ہمارے فقہا اور ائمہ ایک خاص دور اور علاقے میں رہے اس لیے اُن کی نگاہ صرف اس دور یا علاقہ کے مادی حالات میں الجھی رہی۔ انہوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ کیا صرف اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کیا۔ اس لیے فقہ کے جو مختلف مدارسِ فکر آج سے صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجودہ ترقی یافتہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور ان مذاہب کے قانونی احکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لایعنی ہے"۔

فاضل اشارات نگار عالم کی بجائے شاعر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے حقیقت کی نسبت تخیل سے زیادہ کام لیا ہے۔ یہ دیکھ کر میں سراپا حیرت رہ گیا کہ انہوں نے مجھ سے وہ الفاظ و خیالات منسوب کیے ہیں جن کا اظہار ہرگز کسی موقع پر میری زبان سے نہیں ہوا۔ البتہ انہوں نے نہایت چابکدستی سے جھوٹ میں تھوڑا سا سچ بھی ملا دیا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اُن کے لیے راہِ فرار باقی رہے۔ اوپر کی سطور کے خط کشیدہ الفاظ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ اعتراض ہیں۔

اس وقت انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے چونسٹھویں سالانہ جلسہ کی روئداد، جو انجمن کے شعبہ نشر و تالیفات کی طرف سے شائع ہوئی ہے، میرے سامنے ہے۔ اسمیں میرا خطبۂ صدارت (بہ ادنیٰ تغیرات) تمام و کمال صفحات ۷۵ تا ۱۰۵ پر درج ہے۔ میں نے اسے بار بار پڑھا ہے لیکن کہیں بھی اُن الفاظ یا خیالات کا پتہ تک نہیں پایا جن پر فاضل اشارات نگار نے اپنے قصرِ استدلال کی رفیع عمارت استوار کی ہے۔ تاکہ قارئین خود اصلیت کا اندازہ لگا سکیں، میں اصل خطبہ کا مندرجۂ ذیل اقتباس درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں:۔

"میرا اشارہ مولانا ابوالحسنات صاحب کے خطبے کی طرف ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ہر چیز موجود ہے (واضح رہے کہ مولانا نے یہاں تک دعوی فرمایا تھا کہ کتاب اللہ میں سائنس کی جزئیات بھی شامل ہیں۔ ادیب نے اپنے خطبہ میں اسی خیال کی طرف اشارہ کیا تھا)۔ میرے خیال میں یہ اندازِ بیان ایسا ہے کہ جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ قرآنِ مجید الہامی کتاب ہے

اور ہم سب کا فریضہ ہے کہ اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں اور اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھالیں جو قرآنِ مجید نے پیش کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو کے متعلق کافی و وافر معلومات قرآنِ کریم میں موجود ہیں، صحیح نہیں۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب قرآنِ کریم نازل فرمایا تو اُن کے پیشِ نظر لوگوں کو سارے علوم سے آشنا کرنا تھا حالانکہ قرآنِ کریم نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد لوگوں کا تزکیۂ نفس کرنا تھا۔ یہ درست ہے کہ قرآنِ کریم لوگوں کو تفکّر اور تدبّر کی تلقین کرتا ہے اور علماء و فضلاء نے قرآنِ کریم سے استخراج کر کے فقہ اسلامی کی تدوین کی۔ لیکن قرآنِ کریم کو "قانون" کی کتاب کہنا بھی لفظ "قانون" کے مروجہ معنی سے عدمِ واقفیت کی دلیل ہے۔ قانون ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی پرانے زمانے کے لوگوں کے ذہن میں خواہ کچھ ہوں لیکن آج کل کے لوگ اس سے مراد ایسے قوانین لیتے ہیں جو حکومتِ وقت کی طرف سے رائج کیے جائیں اور جن کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا یا مواخذہ مقرر ہو اور اُن کے نفاذ کے لیے ایسا ہاتھ ہو جو ان پر عمل کرانے کی پوری طاقت رکھتا ہو۔ پس لفظ قانون کے مروجہ معنی کی رُو سے قرآنِ کریم "قانون" کی کتاب ثابت نہیں ہوتی۔ (مخفی نہ رہے کہ اس مرحلہ پر مقرر کا مقصد محض دنیاوی قوانین جو مجالسِ مقننہ بناتی ہیں اور اخلاقی یا خدائی قانون میں اصطلاحی حیثیت سے امتیاز کرنا تھا اور مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ اللہ کے احکام قابلِ نفاذ نہیں ہیں)۔ اگر قانون کے معنی کا دائرہ وسیع کر دیا جائے تو قرآنِ کریم میں معاشرت کی بہتری اور اخلاق کی اصلاح کے لیے بعض (لفظ "بعض" روئداد نویس کا نادانستہ اضافہ معلوم ہوتا ہے۔) اعلیٰ درجہ کے قانون یا قواعد ضرور ملیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ لفظِ قانون کی ذیل میں نہیں آتے۔ کیونکہ قانون سے مراد وہ قانون ہے جو حکومتیں رائج کیا کرتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی دنیاوی لحاظ سے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ کہنا ناگزیر ہے کہ قرآنِ مجید میں ہماری رہنمائی کے لیے اصولی مواد تو موجود ہے۔ بعض معاملات کے متعلق قوانین کی صورت میں تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ اس میں ہر علم کی

جزئیات تک موجود ہیں۔ قرآن نے یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ تمہارے لیے آج دین کو مکمل کر دیا گیا اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ یہ دین تمام زمانوں، تمام ممالک اور تمام قوموں کے لیے ہے۔ لیکن یہ امتداد زمانہ ملکوں اور قوموں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ ان کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون کی جزئیات میں تبدیلی کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ تھی کہ اُس نے تمام زمانوں کے لیے ایک اٹل قانون (یعنی جزئیات میں) نہیں بنایا۔ ورنہ زندگی جامد و ساکن ہو کر رہ جاتی۔ اس نے ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق تبدیلی کی گنجائش رکھی۔ شاید بعض لوگ کہیں کہ ہمارے اکابر ائمہ نے پوری تلاش، چھان بین اور تدبّر کے بعد اسلامی قانون بنائے ہیں اور اُن میں ہر زمانے اور ہر ملک کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے فقہا اور علما نے جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ بڑا قابلِ قدر ہے۔ ہمیں ان بزرگوں کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ مخصوص زمانے اور مخصوص ممالک کے لوگ تھے۔ انہیں عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ نہ انہیں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا علم تھا۔ اس لیے اُن کی آراء کو تمام زمانوں کے لیے کلیہ قرار دینا، اسلام کی روح کے منافی ہے۔ آج ہمارے معاشرہ میں جو ذہنی جمود طاری ہے وہ اسی ذہنی افتاد کا نتیجہ ہے کہ اسلاف جو کچھ کر گئے اس سے آگے بڑھنا کفر ہے۔ اب آپ نے ایک اسلامی حکومت قائم کر لی ہے اور اس میں ایک آزاد معاشرہ اُبھر رہا ہے۔ اس کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھیے اور دوسرے ممالک کی رفتارِ ترقی کو نظر کے سامنے رکھ کر اپنے علمی و فقہی ورثہ کا جائزہ لیجیے اور قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر، فقہ میں وہ مناسب تبدیلیاں کیجیے جو آپ ضروری سمجھتے ہوں۔ یہ بات کوئی عجیب نہیں بلکہ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ان ائمہ کرام نے کہا تھا جن کے دفاتر نظیر کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہماری رائے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہم فقہ اسلامی میں ایسی تبدیلیاں کیوں نہ کریں جو ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہوں؟ آخر ان بزرگوں نے بھی تو فقہ مدون کرتے وقت اپنے زمانے کے حالات اور اپنی ضروریات کو پیشِ نظر رکھا تھا۔

اس طویل اقتباس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں لیکن رفع التباس کے لیے یہ ضروری تھا۔
اب اس امر کا فیصلہ آپ کی ضمیر پر چھوڑتا ہوں کہ آیا اصل اقتباس اور مبینہ اقتباس میں جو بین تضاد ہے، وہ دینی احتیاط یا صحافتی دیانت، سے کہاں تک ہم آہنگ ہے اور اسے اشارات نگار کی سادگی اور زود اعتباری پر محمول کیا جائے یا اُن کے راوی کی کذب آمیز تخیل کاری پر۔ کیا فاضل اشارات نگار کو اس تقریر کی بنا پر یہ حق حاصل تھا کہ اس ادنیٰ گنہگار کو اُن لوگوں کے زمرے میں شمار کرے جو اسلام پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کا اسلام سے کوئی ربط نہیں رہا؟۔ فاضل صاحبِ تحریر اُس وعید سے بھی نہیں ڈرے جو حضرت ابوذرؓ سے روایت شدہ حدیث میں موجود ہے "عن ابی ذر رضی اللہ عنہ، سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یرمی رجلٌ رجلًا بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذالک" (رواہ بخاری)

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظ دارد
آہ اگر از پے امروز بود فردائے!

کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کو بجنسہٖ اپنے رسالہ کی کسی قریبی اشاعت میں شامل کر کے مجھے مطلع فرمائیں گے تاکہ میں دیکھ سکوں کہ آپ نے کہاں تک اس اتہام طرازی کی تلافی کی ہے؟۔ اور اگر کسی وجہ سے آپ کی اخلاقی جرأت اس کی اشاعت کی متحمل نہیں ہو سکتی تو میں ممنون ہوں گا اگر آپ یہ خط مجھے واپس کر دیں۔

نیاز مند: شیخ عبدالرحمٰن

جناب ایس۔ اے رحمٰن صاحب کی خدمت میں چند گزارشات

از عبدالحمید صدیقی

مکرمی۔ سلام و رحمت۔

جناب کا نوازش نامہ مدیر "ترجمان القرآن" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی وساطت

سے نظر افروز ہوا۔ یاد آوری کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ میرے جن الفاظ اور فقروں سے آزردہ خاطر ہوئے ہیں، مجھے اُن کے استعمال پر ہرگز اصرار نہیں اس لیے میں نہایت ادب سے اُن کے لیے معافی چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ اس تحریر سے میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہ تھا بلکہ اُن رجحانات کی نشاندہی کرنا تھا جنہیں میں ایمانداری کے ساتھ خلافِ دین پاتا ہوں۔

میں نے آپ کے خط میں دیئے ہوئے طویل اقتباسات کو کئی مرتبہ بڑے غور سے پڑھا ہے اور اس امر کی کوشش کی ہے کہ اپنی اُس غلطی کو معلوم کروں جو میں نے بعض باتیں آپ کی طرف منسوب کرنے میں کی ہے۔ الفاظ کا اختلاف تو بلاشبہ ہے لیکن میں بصد احترام عرض کرتا ہوں کہ میں نے آپ کے جس رجحانِ فکر پر تنقید کی ہے اُس کا سارا مواد آپ کے اس پیش کردہ اقتباس کے اندر بھی موجود ہے۔ اس میں آپ کا موقف جوں کا توں برقرار رہتا ہے اور مجھے تعجب ہے کہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے آپ نے میرے اوپر اعتراض کرنے کی بجائے خود اُسی پر کیوں غور نہیں فرمایا۔ میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ پھر ایک مرتبہ اپنی اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیں:۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ کہنا ناگزیر ہے کہ قرآن مجید میں ہماری رہنمائی کے لیے اصولی مواد تو موجود ہے بعض معاملات کے متعلق قوانین کی صورت میں تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ اس میں ہر علم کی جزئیات تک موجود ہیں۔ قرآن نے یہ دعویٰ ضرور کیا کہ تمہارے لیے آج دین کو مکمل کر دیا گیا اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ یہ دین تمام زمانوں، تمام ممالک، اور تمام قوموں کے لیے ہے۔ لیکن بامتدادِ زمانہ ملکوں اور قوموں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، اُن کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون کی جزئیات میں تبدیلی کرنے کی اجازت دی ہے۔"

اقتباس کا یہ آخری فقرہ جو درحقیقت آپ کے اس مضمون کی جان ہے اور جس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے اسے خط کشیدہ لکھا ہے ۔ یہی دراصل سب سے بڑی

غلطی ہے۔ آپ براہِ کرم کسی ایسی آیت کی نشاندہی کریں جس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُن قانونی جزئیات میں تبدیلی کر لینے کی اجازت دی ہو جو قرآن مجید میں مقرر کر دی گئی ہیں۔ آپ اللہ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہے ہیں جو اُس نے بالکل نہیں کہی اور جو دین کے سراسر منافی ہے۔ اللہ نے تو اپنا دین نازل ہی اس لیے کیا ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی ڈھانچوں کو اس کے مطابق ڈھالیں اور آپ اس کے خلاف اس بات کی تلقین کر رہے ہیں کہ دین کو وقتی تقاضوں اور مصلحتوں کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ یہ ایک بُرا بول ہی نہیں بلکہ ایک ایسی جسارت ہے جس کی توقع آپ جیسے صاحب علم سے قطعاً نہیں کی جا سکتی۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جسے ہم دینِ حنیف کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ دینِ حق کوئی سیال چیز نہیں جو ہر سانچے میں ڈھل جائے بلکہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک ازلی و ابدی ضابطۂ حیات ہے اور دنیا کے ہر فرد سے اس بات کا شدید تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی جملہ خود مختاریوں سے یکسر دست بردار ہو کر اپنے آپ کو بالکلیہ اس کا پابند کر دے۔ اسی سے اُس کی نجات وابستہ ہے اور اسی میں اُس کی فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ زمانے کے پیہم بدلتے ہوئے تقاضوں اور وقت کی سیمابی مصلحتوں کو اگر معیار بنا کر دین کو اُس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اسلام کا مقصدِ وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام تو دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ہر دور میں نوعِ انسانی کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے۔ لیکن جس حیثیت سے اُسے آپ پیش کر رہے ہیں اُس میں تو اُس کی پوزیشن اُس وفادار غلام کی سی بن جاتی ہے جس کا کام آقا کے ہر فعل کے لیے وجہِ جواز تلاش کرنا ہے۔ قرآنِ مجید نے تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب نہیں عطا کیا کہ آپؐ کسی امرِ خداوندی میں تبدیلی کریں یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں درج ہے۔ میں طوالت کے خوف سے صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	(اے محمد)! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ	حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے

وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ
مِنَ الْحَقِّ ط (المائدہ۔ رکوع ۷)

آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اُس
کی محافظ و نگہبان ہے لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ
قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو
اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے مُنہ موڑ
کر اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔ (البقرہ۔ رکوع ۱۴)

کہدو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے
ورنہ اگر اُس علم کے بعد، جو تمہارے پاس آچکا ہے
تم نے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی
پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار
تمہارے لیے نہیں ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ
اللّٰهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهٖ ط إِلَيْهِ
أَدْعُوْا وَإِلَيْهِ مَآبِ ۔ وَكَذٰلِكَ
أَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ط وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۔
(الرعد۔ رکوع ۵)

کہو مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا
گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی
کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں۔ لہٰذا میں
اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی
طرف میرا رجوع ہے۔" اس ہدایت کے ساتھ
ہم نے یہ فرمانِ عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب
اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس
آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ
کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے
اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

یہ واقعہ بھی خود قرآن میں مذکور ہے کہ سرکارِ رسالتمآب نے ایک مرتبہ ایک حلال چیز (شہد)

کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (سورۂ تحریم)

اے نبی وہ چیز حرام کیوں کرتے ہو جس کو تمہارے لیے خدا نے حلال کیا ہے۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی الٰہی احکام سے ہٹنے کا اختیار نہیں ہے تو بادشاہ کو یہ اختیارات کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ اور ایک مسلمان کس طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ جو امور کلی یا جزئی طور پر قرآن میں طے کر دیئے گئے ان میں وہ ردو بدل کر لینے کا مجاز ہے۔

پھر یہ معاملہ صرف قرآن حکیم تک ہی محدود نہیں بلکہ مسلمانوں کو اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات و احکام کی جو تشریحات فرمائی ہیں ان کی بھی وہ بے چون و چرا پیروی کریں۔ آپؐ کی ان تشریحات کے مقابلہ میں امت کے کسی فرد یا گروہ کے خیالات و افکار کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی اور کسی شخص یا جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اس میں وہ کوئی اصولی یا جزوی تبدیلی کر سکے۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے :۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (حشر رکوع ۱)

جو تم کو رسول نے دیا اُس کو لے لو اور جس سے تم کو روکا اُس سے باز رہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء : ۹)

پس نہیں، تمہارے رب کی قسم (اے محمد) وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ (تمہارے فیصلے) کو سربسر تسلیم کر لیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ

إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ	اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

قرآن مجید کی محولہ بالا آیات تو آپ کے اس فلسفۂ اجتہاد کی کھلی کھلی تردید کر رہی ہیں کہ ہم خدا اور رسول کے قانونی احکام میں بھی ردّ و بدل کر لینے کے مجاز ہیں۔

آئیے اب ہم خلفائے راشدین کے طرزِ عمل پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کتاب و سنت کے معاملے میں اُن کا موقف آپ سے کس قدر مختلف تھا۔ یہ حضرات کسی امر کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وقت کا مطالبہ کیا ہے بلکہ صرف یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کے بارے میں خدا اور رسولؐ نے انہیں کیا حکم دیا ہے۔ سیرتِ صحابہؓ میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں کہ ان پاکباز انسانوں نے کتاب و سنت کا حکم معلوم ہو جانے کے بعد اپنے بہت سے کیے ہوئے فیصلے بدل دیئے، محض معمولی باتوں ہی میں نہیں بلکہ ایسے معاملات میں بھی جو مسلمانوں کے لیے زندگی و موت کا حکم رکھتے تھے۔ دارمی نے میمون بن مہران کے واسطہ سے حضرت صدیقؓ کا طرزِ عمل ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

اذا ورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیہ ما یقضی بہ بینہم قضی بینھم وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فی ذالک الامر سنۃ قضی بھا فان اعیاہ خرج فسأل المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فھل علمتم ان رسول اللہ	جب ان کے سامنے کوئی اختلافی مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ سب سے پہلے کتاب اللہ میں غور فرماتے۔ اگر کتاب اللہ میں حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فریقین فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں اس کا کوئی حکم نہ ملتا اور سنت نبوی میں مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ اگر کتاب و سنت دونوں میں اس کا حکم نہ ملتا تو عام مسلمانوں سے دریافت فرماتے تھے

صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی ذالک بقضاء فربما اجتمع علیہ النفر کلھم یذکر عن رسول اللہ فیہ قضاءً فیقول ابو بکر الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علینا دیننا	کہ اگر تم میں سے کسی کو اس طرح کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلے کا علم ہو تو بتائے۔ چنانچہ بسا اوقات متعدد آدمی آکر اس کے بارے میں سنت نبوی کی اطلاع دیتے تو آپ اس کے مطابق فیصلہ دے دیتے اور پھر فرماتے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم میں ایسے اشخاص پیدا کیے جو ہمارے لیے ہمارے دین کو محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا وہ فرمان بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھیجا تھا۔

"جو مسائل ایسے پیش آئیں جن کا حکم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے نہ معلوم ہو۔ ان میں بڑی سمجھداری سے کام لینا۔ اور جو امور پہلے سے ثابت شدہ ہیں ان پر نئے مسائل کو پیش کرنا اور ان کے امثال و نظائر کو سامنے رکھنا۔ پھر جب کسی نتیجہ پر پہنچ جانا تو فیصلہ دیتے وقت یہ بات ذہن میں تازہ رکھنا کہ وہی فیصلہ کرنا ہے جو خدا کو پسند اور حق کے قریب ہو۔"

ان تفصیلات کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسلام ہمیں وقتی مصلحتوں کے مطابق اُن احکام میں اصولی یا جزئی تبدیلی کرنے کی اجازت دیتا ہے جو خدا اور رسول سے منصوص ہوں۔

آپ کے اقتباسات کے آخری حصے بھی ایک ایسے طرزِ فکر کی غمازی کرتے ہیں جنہیں کسی طرح بھی صحیح نہیں کہا جا سکتا:۔

"شاید بعض لوگ کہیں کہ ہمارے اکابر ائمہ نے پوری تلاش، چھان بین اور تدبر کے بعد اسلامی قانون بنائے ہیں اور اُن میں ہر زمانے اور ہر ملک کی ضروریات کا لحاظ رکھا

گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے فقہاء اور علماء نے جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ بڑا قابل قدر ہے۔ ہمیں ان بزرگوں کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ مخصوص زمانے اور مخصوص ممالک کے لوگ تھے۔ انہیں عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ نہ انہیں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا علم تھا۔ اس لیے اُن کی آرا کو تمام زمانوں کے لیے کلیہ قرار دینا اسلام کی روح کے منافی ہے"۔

اس ضمن میں پہلی گزارش یہ ہے کہ علماء کا کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس بات کا دعویدار ہو کہ ہمارے اکابر ائمہ نے پوری تلاش، چھان بین اور تدبر کے بعد جو اسلامی قانون بنائے ہیں اُن میں ہر زمانے اور ملک کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خود وہ اکابرینِ امت جنہوں نے اس عظیم خدمت کو سرانجام دیا، انہوں نے بھی کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ آپ کے اس سارے استدلال میں بنیادی خامی یہ ہے کہ آپ نے اپنے دلپسند نظریہ کو برحق ثابت کرنے کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ آپ پہلے ایک غلط مفروضہ قائم کرتے ہیں اور پھر اُس کی تردید کے لیے ایسے دلائل لاتے ہیں جن سے آپ کے نقطۂ نظر کی تائید ہو سکے۔ چنانچہ اسی اقتباس میں دیکھیے کہ پہلے آپ نے ائمہ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کی ہے جو انہوں نے کبھی نہیں کہی اور پھر خود اس کی تردید بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حربہ کسی مناظر کے لیے مفید اور کارآمد ہو تو ہو لیکن یہ طریق آپ جیسے صاحب علم و فضل کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

پھر اس اقتباس میں آپ یہ بھی دیکھیں کہ آپ زمان و مکان کے اختلاف کو کس طرح ابھار ابھار کر لاتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ فقہا ایک مخصوص زمانے اور مخصوص علاقے کے لوگ تھے اس لیے اُن کی آراء کو ازلی اور ابدی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آپ کی یہ بات بظاہر بالکل ٹھیک اور درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ذرا گہرائی میں اُتر کر اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مختلف ادوار میں پیدا ہونے والے ان فقہائے امت کے اجتہادات میں، جو اختلاف پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد آپ کے نزدیک زمانہ اور ملک ہے۔ اس طرز فکر کو کسی طرح بھی درست نہیں

قرار دیا جاسکتا۔ امت کے مختلف ائمہ نے خواہ وہ کسی ملک اور زمانہ سے تعلق رکھتے تھے، جب کبھی ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے تو اس کی بنیاد زمانی اور مکانی مصلحتیں نہ تھیں بلکہ کتاب و سنت تھی۔ جب کسی ایک امام نے کسی دوسرے امام کے استنباط کو رد کیا ہے تو وہ قرآن و سنت سے دلائل لائے ہیں۔ ہمیں تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ زمانہ اور ملک کے تبدیل ہوجانے کی وجہ سے کسی فقہی استنباط کو ساقط الاعتبار قرار دیا گیا ہو۔ دنیا کا ہر مسلمان بڑے سے بڑے فقیہ اور عالم کی رائے کو ترک کرنے پر تیار ہوجاتا ہے بشرطیکہ اُس کی کسی رائے کو خدا اور رسول کے فرمان کے خلاف ثابت کر دیا جائے۔ ممکن ہے بعض حضرات یہ کہیں کہ شریعت میں اس امر کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض احکام زمانہ کے تغیّر کے ساتھ تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس چیز کی مثالیں موجود ہیں لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ احکام تمام تر وہی ہیں جو عرف اور مصلحت پر مبنی تھے نہ کہ کتاب و سنت کے نصوص یا ان کے اشارات پر۔ جو اجتہادات عرف یا مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں وہ بلاشبہ عرف اور مصلحت کے تبدیل ہوجانے سے بدل جایا کرتے ہیں۔ لیکن یہ اصول صرف عرف اور مصلحت کے دائرہ میں چلتا ہے اس کو ساری شریعت پر منطبق کر دینا اور اصولِ دین سے بے خبری کی ایک نہایت افسوسناک مثال ہے۔

آپ نے معاشرے میں جس ذہنی جمود کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ ہمارے اس دور کا ہر لکھا پڑھا مسلمان اپنے پرانے علمی و فقہی ورثہ کا جائزہ لینے اور نئی ضرورتوں کے پیش نظر مناسب تبدیلیاں کرنے کا خواہشمند ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرتا۔ اس میں سب ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ اختلاف جس امر میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فقہ میں تبدیلیوں کی اساس اور بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی بنا وقتی مصلحتیں اور ملکی تقاضے ہیں۔ اِس طرز فکر کو ہم صحیح اور درست نہیں سمجھتے اور اسے اسلامی اصولِ شریعت کے سراسر منافی خیال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک فقہ میں تبدیلی کی پوری پوری گنجائش

موجود ہے۔ ہم ان بزرگ و برتر ہستیوں کو جنہوں نے یہ فقہ مرتب کی انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے کے باوجود انہیں بری عن الخطا نہیں سمجھتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم تبدیلی کی گنجائش کے صرف اسی صورت میں قائل ہیں جبکہ کوئی شخص یا گروہ دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دے کہ ان حضرات کا فلاں فلاں استنباط قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے ہاں "فقیہ مصلحت پرست" کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہم اُس فقیہ کے طالب ہیں جو ہمارا تعلق خدا اور رسول کے ساتھ جوڑ دے اور ہماری کشتِ حیات کو کتاب و سنت کے سرمدی چشموں سے سیراب کر دے۔

ہمارے علماء اور صلحاء نے بلاشبہ کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کی رائے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بنا پر ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم فقہ اسلامی میں تبدیلیاں کریں لیکن ان تبدیلیوں کی اساس بھی صرف کتاب و سنت ہی بن سکتی ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اگرچہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں جنم لیا اور مختلف حالات میں اپنی زندگیاں گزاریں لیکن انہوں نے کبھی بھی تعلیماتِ الٰہی کو وقتی ضروریات کے مطابق نہیں ڈھالا بلکہ ہمیشہ کتاب و سنت کو معیار مان کر ضروریات کو اُس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

بیجا نہ ہوگا اگر آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں پوری غور و فکر کے باوجود اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ جو یہ ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ قرآن مجید کوئی قانون کی کتاب نہیں تو اس سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت ہو اور پھر اس میں قرآن کے احکام کو قانون نہ مانا جائے، یہ چیز کسی ایسے شخص کے لیے قابلِ تصور نہیں ہے جو قرآن کے احکام کو سمجھ کر اس پر ایمان لایا ہو۔ کفار کی حکومت میں تو قرآن کے احکام بلاشبہ قانون نہیں ہونگے کیونکہ وہ اسے کتابِ الٰہی نہیں مانتے، لیکن جہاں اس کو کتابِ الٰہی ماننے والے لیجسلیچر اور جج ہوں وہاں اس کا قانون نہ ہونا لازماً یہی معنی رکھتا ہے کہ یا تو وہ ایمان نہیں رکھتے یا پھر اس بات کا شعور نہیں رکھتے کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔ اگر لوگ غلط فہمی یا جہالت کی بنا پر کسی چیز کو غلط حیثیت دے دیں تو اس سے حقیقت تو ساقط الاعتبار نہیں ہو سکتی۔ حقیقت تو اپنی جگہ ہمیشہ حقیقت ہی رہتی ہے اور اس امر کی قطعاً محتاج

(باقی ص ۔۔)

اسلام اور تہذیبِ مغرب میں انسانی مساوات کی حقیقت

از مصطفیٰ سباعی پرنسپل شریعت کالج، شام

اسلامی تہذیب اپنے دامن میں جو فضائل و مکارم رکھتی ہے ان میں سے ایک انسانی مساوات ہے، جو دراصل اسلام کی آفاقیت اور انسان دوستی (HUMANISM) کا مظہر اور انسانوں کے اندر رنگ و نسل سے قطع نظر ایک حقیقی وحدت و یگانگت پیدا کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن کا یہ بیان کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ" اسی مساواتِ عامہ کا اعلان ہے، جس نے بنی نوع انسان کے تمام مادی و حسی امتیازات پر خطِ تنسیخ پھیر کر صرف تقویٰ اور خدا ترسی کو وجہِ امتیاز اور معیارِ فضیلت قرار دیا ہے۔ اسی اعلان کی مزید وضاحت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جمِ غفیر کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائی:

الناس من آدم و آدم من تراب لا فضل لعربی علی عجمی ولا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ۔	تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں فضیلت صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر ہے

اسلامی تہذیب میں انسانی مساوات کے مظاہر اسلامی تہذیب کا یہ نظریۂ مساوات محض خوشنما الفاظ اور اصولوں کی حد تک نہ تھا کہ گاہے گاہے ملکی و غیر ملکی تقریبات میں ان کے اظہار سے لذتِ تقریر حاصل کر لی جایا کرے، جیسا کہ تہذیبِ جدید کے علمبرداروں کا شیوہ ہے، بلکہ اسلامی معاشرے میں یہ مساوات اپنی پوری شان کے ساتھ عملاً جلوہ گر تھی اور اسلامی معاشرے کے لیے یہ کوئی ایسی اجنبی اور غیر معمولی چیز نہ تھی جس کے نفاذ کے لیے محنت و مشقت اٹھانی پڑی ہو۔ چنانچہ اسلام نے تمام اجتماعی مواقع پر اس مساوات کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ مساجد میں اس

مساوات کو نافذ کیا ہے۔ جہاں ایک ہی صف میں کالے اور گورے کھڑے ہو کر اپنے خالق کی بندگی کرتے ہیں اور انکساری و سرافگندگی سے اپنے ہیچ میرز ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اور کوئی گورا کالے کے پہلو میں کھڑا ہونے سے انقباض یا اپنی توہین و تذلیل محسوس نہیں کرتا۔ حج میں اس کو نافذ کیا ہے جہاں ہر رنگ اور ہر نسل کے انسان دوش بدوش مناسکِ حج ادا کرتے ہیں اور بلا امتیازِ ابیض و اسود ایک ہی نوع کے لباس میں ملبوس ہو کر اپنے عجز و ضعف کا اعتراف کرتے ہیں۔

تاریخ اسلامی میں مساوات کی حیرت انگیز شہادت | اسلامی تاریخ میں انسانوں کے اندر رنگ و نسل کی تفریق کو مٹانے کی اس سے بڑھ کر حیرت انگیز شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے دن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے افریقہ کے ایک سیاہ فام باشندے — بلالؓ — کو حکم دیا کہ وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اسلام کے غلبہ کا اعلان کریں۔ غور کیجیے کعبہ وہ مقام ہے جو دورِ جاہلیت میں بھی عربوں کی نگاہوں میں حرم مقدس تھا اور اسلام میں بھی اُسے قبلۂ مسلمین ہونے کا شرف حاصل ہے، اُس کی چھت پر سیاہ فام باشندہ کیونکر چڑھ سکتا ہے اور کیونکر اُسے اپنے قدموں کے نیچے روند سکتا ہے، بے شک تہذیبِ مغرب اس کا تصوّر کرنے سے بھی قاصر ہے، لیکن اسلامی تہذیب آج سے چودہ سو برس قبل مساواتِ انسانی کا یہ عملی مظاہرہ کر چکی ہے۔ بامِ کعبہ پر حضرت بلالؓ کا چڑھنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ انسان — خواہ کالا ہو یا گورا — ہر چیز پر شرف اور برتری رکھتا ہے اور وہ اس شرف اور برتری کا مستحق نسل و نسب اور رنگ و قوم سے نہیں بلکہ علم و عقل اور اخلاق و ایمان کی بدولت ہو سکتا ہے۔ انسان اگر اعمال و اخلاق میں پسماندہ ہے تو جلد کی سفیدی اُسے فوقیت نہیں دے سکتی اور اگر اُسے بصیرت و عرفان اور اعمالِ صالحہ میں برتری حاصل ہے تو اُسے جسم کی سیاہی فروتر نہیں کر سکتی۔ ایک بار ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ نے حضرت بلالؓ کو یا ابن السوداء (اے کالی ماں کے بیٹے!) کہہ کر پکارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو اس انداز کو سخت ناپسند کیا بلکہ آپ نے حضرت ابوذرؓ کو جھڑکا اور فرمایا: اعیرتہ بسواد اُمّہ انک امرؤ فیک جاھلیۃ (کیا تم بلالؓ کو ماں کے کالی ہونے کا کوسنا دیتے ہو۔ تمہارے اندر تو ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے)۔

جاہلی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے مابین یہی خطِ فاصل ہے۔ جاہلی تہذیب جس رنگ پرستی اور نسب و نسل کو اپنے لیے فخر و ناز کا سرمایہ اور علم و دانش کا پیمانہ قرار دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب میں وہ سراسر جاہلیت اور نادانی ہے۔

جس تہذیب کی شان یہ ہو کہ اس میں کسی نسب کو دوسرے نسب پر اور کسی رنگ کو دوسرے رنگ پر استبداد و تفوق کی اجازت نہ ہو بلاشبہ اس تہذیب کی گود انسانیت کے لیے موجبِ سعادت ہوگی، لیکن جس تہذیب کے گہوارے میں گورا تو ہر طرح کے تسلط و تغلب کا مجاز ہو لیکن کالے کے نصیب میں بجز ذلت و رسوائی کچھ نہ ہو۔ ساری سعادتیں اور منفعتیں سفید جلد نے اپنے لیے مختص کرلی ہوں اور شقاوتوں اور صعوبتوں کا سارا طومار سیاہ جلد کے گلے میں منڈھ دیا گیا ہو وہ تہذیب اپنی رنگا رنگ ترقیوں اور ظاہری چمک دمک کے باوجود جاہلیت کی تاریک وادی میں بھٹک رہی ہے اور انسانیت کو صدیوں پیچھے اس حال میں پھینک رہی ہے جہاں کور چشمی، بے جا فخر و غرور اور جہالت و حماقت کے سوا کچھ نہیں مگر اسلامی تہذیب نے قدم قدم پر اس طرح کی نسلی و لونی تفریقوں کی بیخ کنی کی ہے اور اپنی عبادت گاہوں میں، تعلیمی اداروں میں، سیاسی و معاشی میدانوں میں، عدالت و قیادت کے منصبوں میں حتیٰ کہ دشمن کی دشمنی اور دوست کی دوستی تک میں نسل پرستی کا اکل کھرا پن ختم کیا ہے۔

سیاہ فام اور منصبِ قیادت | حضرت عمرو بن العاص کی زیر سرکردگی جب اسلامی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں اور قلعہ بابلیون کے سامنے انہوں نے خیمے نصب کر لیے تو مصر کے بادشاہ مقوقس نے صورتِ حال کو دیکھ کر اسلامی فوجوں سے گفتگو کی خواہش کی اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے پاس ایک وفد بھیجا اور مسلمانوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ بھی اپنا ایک وفد اس کے پاس بھیجیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص نے دس افراد پر مشتمل ایک وفد شاہِ مصر کی جانب روانہ کیا۔ وفد میں حضرت عبادہ بن صامت بھی تھے جن کا رنگ انتہائی کالا تھا۔ اور قد میں بھی خاصے لمبے تھے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ان کا قد ۵ فٹ کے قریب تھا۔ حضرت عمرو بن العاص نے حکم دیا کہ وفد کی طرف سے تمام بات چیت وہی کریں۔ جب یہ وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا اور حضرت عبادہ بن صامت گفتگو کے لیے آگے بڑھے

تو مقوقس ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور کہنے لگا: اس کالے شخص کو میرے سامنے سے ہٹا دو اور کسی دوسرے کو گفتگو کے لیے آگے کرو۔ مقوقس کے ان الفاظ پر تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور یک زبان ہو کر بولے: "یہ کالا شخص ہمارا سردار ہے، علم و عقل میں ہم سب سے افضل ہے۔ ہم سب اس کے حکم کے تابع اور اس کی رائے کے پابند ہیں۔ امیر سپاہ نے ہم سب کو چھوڑ کر اسے ہمارا قائد بنایا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مقوقس نے جواب دیا: اس اسود کو اپنا سردار ماننے پر تم کیسے راضی ہو گئے ہو، حالانکہ اسے تم سب سے کم تر ہونا چاہیے۔ ارکانِ وفد نے فوراً کہا: یہ خیال غلط ہے۔ اگرچہ یہ شخص تیری نظروں میں سیاہ ہے، لیکن مرتبہ و مقام میں سبقتِ اسلام میں اور عقل و تدبر میں ہم میں سے کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ باقی رہی جسم کی سیاہی تو وہ ہمارے مسلک میں کوئی قابلِ اعتراض اور معیوب چیز نہیں ہے۔" بالآخر شاہ مقوقس نے حضرت عبادہؓ سے کہا: اے اسود! تو ہی آگے بڑھ کر مجھ سے گفتگو کر۔ یہ گفتگو نرمی کے ساتھ ہو کیونکہ تیری سیاہی سے میرا دل دہل رہا ہے۔ اگر تو نے تندی سے کام لیا تو میرا ہراس مزید بڑھ جائے گا۔ حضرت عبادہ نے مقوقس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر فرمایا: "ہماری فوج میں ایک ہزار کالے سپاہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک مجھ سے زیادہ کالا ہے۔"

قدیم دورِ جاہلیت کا غیر مہذب انسان ـــ اور بیسویں صدی کا مہذب انسان بھی ـــ بشرے کی سیاہی کو ایک عیب خیال کرتا تھا۔ وہ کالے رنگ کے انسان کو یہ حق دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ وہ سفید رنگ والوں کی صف میں رکھا جائے۔ کجا یہ کہ وہ ان کا قائد اور پیشوا ہو۔ اور علم و تدبر میں ان سے افضل گردانا جائے لیکن اسلامی تہذیب کے جسم نے غیر عقلی امتیازات کے یہ تمام پیمانے چکنا چور کر دیئے اور انسانی تفریق کے نظریے کو جہالت و حماقت قرار دیا۔ اور اس بات کی کھلی چھٹی دے دی کہ اگر کوئی سیاہ فام علم و فکر میں، شجاعت و بسالت میں اور ایمان و اخلاق میں فوقیت رکھتا ہے تو وہ اونچے سے اونچے منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ورنہ اسلامی تاریخ کا ہر باب اس قسم کی

مثالوں سے بھرا پڑا ہے، اور ہمیں ایسے سیاہ فاموں کی طویل فہرست ملتی ہے جن کو اسلامی تہذیب نے ملّت کا ہیرو قرار دیا ہے۔

سیاہ فام مسندِ افتا پر | اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان زمانۂ حج میں اعلان کروایا کرتا تھا کہ امامِ اہلِ مکّہ عطاؔ بن ابی رباح کے علاوہ کوئی شخص فتویٰ نہ دے۔ یہ عطاء بن ابی رباح اہلِ مکّہ کے مرجع و پیشوا شکل و صورت کے لحاظ سے کیسے تھے؟ اس کی تفصیل حافظ ذہبی مصنّف تذکرۃ الحفّاظ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:۔

"عطاء سیاہ فام، یک چشم، چپٹی ناک والے، ایک ہاتھ سے معذور اور اپاہج تھے۔ بال گھنگھریلے تھے۔ دیکھنے والے کو ان کے چہرے سے علم و فضل کی کوئی علامت نظر نہ آتی۔ جب وہ اپنے حلقۂ درس میں ہزاروں تلامذہ کے درمیان تشریف فرما ہوتے تو معلوم ہوتا کہ گویا روئی کے کھیت میں کوا بیٹھا ہے۔"

لیکن اسی عطاءؒ کو اسلامی تاریخ نے ملّت کی امامت و مرجعیت کے مسند پر سرفراز کیا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں سے ہزاروں سفید رنگ والے علم و فضیلت سے بہرہ مند ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک تاریخ کا درخشندہ ستارہ شمار ہوتا ہے۔

سیاہ فام فقہاء و علماء | فقہ حنفی کی مشہور کتاب کنزالدقائق کے شارح عثمان بن علی زیلعی اور نصب الرایہ کے مؤلف حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی (ف ۷۶۲ھ) دونوں عالم سیاہ رنگ تھے اور حبشہ کے ایک شہر زیلع کے باشندے تھے۔ مگر آج تک مسلمان ان کو اس حیثیت سے تو جانتے ہیں کہ ان کی تالیفات فقہ حنفی کی کتب ماخذ میں شمار ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا کیا نسب تھا، کیسا رنگ تھا، کس قوم سے تعلق رکھتے تھے؟ ان باتوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا اور نہ ہی اسلامی تہذیب کا پیدا کردہ ذوق ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔

شعراء و ادباء کی ایسی معتدبہ تعداد ہمیں ملتی ہے جو حبشی تھے مگر خلفاء اور وزراء کے مصاحب رہے ہیں۔ کافور اخشیدی سے کون ناواقف ہے۔ یہ ایک سیاہ فام غلام تھا۔ اس نے چوتھی صدی ہجری میں مصر کی اسلامی سلطنت پر حکمرانی کی ہے۔ عربی کا مشہور شاعر متنبی اس کے دربار سے وابستہ رہا ہے اور

اس نے اپنی ہجو و مدح سے کافور کو تاریخ میں شہرتِ دوام بخشی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی تہذیب کا مزاج اسود و احمر کی کوئی حد بندیوں سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اس تہذیب کی تاریخ میں کوئی ایسا سیاہ باب نہیں ملتا جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہو کہ مسلم آبادیوں میں سیاہ فام نسل کی مخصوص بستیاں اور مخصوص سوسائٹیاں تھیں جن میں سفید فام داخل ہونا یا سکونت پذیر ہونا اپنی ناک کٹ جانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ نہ ہی اس تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ دستیاب ہوتا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ گورے کالوں کو حقارت و استخفاف کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بربنائے رنگ اُن کو اپنے غیظ و غضب اور سیاسی تشدد کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ اس کے علی الرغم تاریخ اسلامی کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ جس تہذیب کی یہ تاریخ ہے وہ آفاقی اور انسانی تہذیب ہے۔ ابنائے بشر کو نسل و رنگ اور قوم و وطن کی عینک سے دیکھنے کے بجائے انہیں حق اور خیر کی میزان سے تولتی ہے اور انہیں ایک ہی باپ کی اولاد تصور کرتی ہے۔ سیاہی اور سپیدی اس کی نگاہ میں اگر کوئی وزن رکھتی ہے تو وہ انسانی جلد کی سیاہی و سپیدی نہیں بلکہ اعمال کی سیاہی اور سپیدی ہے اور اس کا اٹل اصول ہے کہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

مغرب کا تضادِ قول و عمل | تقریباً نصف صدی سے گورے اور کالے کی تفریق کے مسئلے پر بحث کا بازار گرم ہے۔ حالانکہ یہ بدیہی امر ہے کہ سیاہ و سفید کی تفریق سخت وحشیانہ فعل ہے۔ اسے کوئی ترقی یافتہ تہذیب اختیار نہیں کر سکتی اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اسلامی تہذیب جو بنی نوع انسان کے اندر اخوت و مساوات قائم کرنے میں تمام انسانی تہذیبوں سے ممتاز اور شہرت یافتہ ہے، کوئی امتیازات کو ہرگز جائز اور صحیح نہیں قرار دے سکتی۔ لیکن جب سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا ہے اور انسانی حقوق کے چارٹر کا اعلان ہوا ہے۔ تاریخ کی اس پیش پا افتادہ حقیقت پر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ کیونکہ حقوقِ انسانی کے اعلانات کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان حقوق کی سخت پامالی ہو رہی ہے۔ مثلاً دنیا دیکھ رہی ہے کہ جنوبی افریقہ

میں امتیازِ رنگ کے تصور نے انسانی خون کی ندیاں بہا دی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے، کینیا کی آبادیوں میں استعمار دل گداز جرائمِ سلب و نہب کا ارتکاب کر رہا ہے۔ امریکہ میں حبشی اور ریڈ انڈین لونی تفریق کی بنا پر سیاسی و اقتصادی تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوگی کہ یہ کارنامہ مشرق کے لوگوں کا نہیں کہ ان پر رجعت پسندی، وحشت اور پسماندگی کا اتہام لگایا جا سکے جیسا کہ بالعموم اہلِ مغرب مشرقی دنیا پر اس طرح کے اتہامات کی بارش برساتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ انہی ترقی یافتہ اور مہذب و متمدن ممالک کا کارنامہ ہے جو حقوقِ انسانی کا اعلان کرنے والی انجمن کے سب سے اہم اور بااثر رکن ہیں۔ مثلاً امریکہ ہے جسے اقوامِ متحدہ پر غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل ہے۔ انگلستان ہے جسے یورپ کی سب سے بڑی سلطنت ہونے کا فخر حاصل ہے اور اپنی ڈیموکریسی پر بڑا ناز ہے جنوبی افریقہ بھی اپنے یورپین فرمانرواؤں کی بدولت اقوامِ متحدہ کا نمائندہ ہے اور وہی فرمانروا ہی اس کے اوپر تسلط جمائے ہوئے ہیں اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو بھی اقوامِ متحدہ کے حلقوں میں مؤثر مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ یہی وہ حکومتیں ہیں جو بڑی بے حیائی کے ساتھ بیسویں صدی میں انسانی دنیا پر ایسے شرمناک مظالم توڑ رہی ہیں کہ انسانی تاریخ نے انسان پر انسان کے تشدد و جور کے ایسے شرمناک مظالم اپنے کسی دور میں بھی مشاہدہ نہیں کیے۔

افریقہ میں سفید فام نسل کی حکمرانیاں باوجودیکہ اقوامِ متحدہ کا افریشیائی گروپ اقوامِ متحدہ کے گذشتہ اجلاسوں میں رنگ کی بنا پر سفید فام و سیاہ فام کے حقوق و مراعات میں تفریق کے خلاف سخت احتجاج کر چکا ہے، لیکن جنوبی افریقہ کے حکام تاہنوز ان احتجاجات کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دے رہے ہیں اور متواتر اپنی وحشیانہ سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اسی طرح انگلستان کینیا میں ماؤ ماؤ کی آزادی پسند تحریک کو کچلنے کے لیے مسلسل قومی کشت و خون برپا کیے ہوا ہے۔ بلکہ ابھی تک اپنے اُس اراضی ایکٹ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں جو ۱۹۱۵ء سے کینیا میں نافذ ہے اور جس کی رُو سے ۲۹ ہزار یورپین آباد کاروں کو اراضی پر وہ حقوق حاصل ہیں جو افریقہ کی اصل آبادی کی ۵۴ لاکھ ۵۵ ہزار کی تعداد کو حاصل نہیں ہیں، اور وہ اپنی ہی زمینوں پر لاوارث اور اپنے ہی وطن میں

بے وطن ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ سر الیوٹ، جو کینیا میں پہلا انگریز ہائی کمشنر تھا اور ۱۹۰۰ء میں اس کا تقرر ہوا تھا، کینیا میں اپنی حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے: "مستعمرہ کینیا کا تمام اندرونی حصہ سفید انسان کی سرزمین ہے۔ اس امر کا اعتراف نہ کرنا منافقت ہوگا کہ سفید فام باشندوں کی مصلحتوں اور بہبودیوں کو بہرحال ترجیح اور غلبہ حاصل ہونا چاہیے۔ ہم آئندہ جو پالیسی اختیار کریں یا جو قانون سازی عمل میں لائیں اس کا بنیادی مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس ملک کو سفید فام کالونی میں تبدیل کر دیں" یہ پالیسی آج تک کینیا کے انگریز حکام کے مدِنظر چلی آ رہی ہے۔ اور وہ اس امر کی انتہائی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ سرزمینِ کینیا کا چپہ چپہ گوروں کے تصرف میں ہونا چاہیے اور وہ اس کی پیداوار کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں۔

اراضی ایکٹ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ گورنر کو اس امر کی مکمل اجازت دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے زمین کا مالک ٹھہرا دے۔ اور جس قطعۂ زمین کا رقبہ ۵ ہزار ایکڑ سے زائد نہ ہو گورنر صاحب کو اختیار ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو معمولی کرائے پر ۹۹۹ سال تک کے لیے دے سکتا ہے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفاذِ قانون کے بعد دس سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۲۵ء تک یہ حالت ہو گئی کہ ایک سفید فام کے پاس اراضی کی اوسط مقدار ۵۰۰ ایکڑ تھی جبکہ وہاں کے رہنے والے افریقی کے پاس اراضی کی اوسط مقدار صرف ۵ ایکڑ تھی۔ اسی طرح سیاہ فام اہلِ وطن کو سفید فام آبادکاروں سے جدا رکھنے کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کی گئی اس کی صورت یہ تھی کہ سیاہ فام انسانوں کو مخصوص آبادیوں میں محصور کر دیا گیا جہاں سے انہیں متجاوز ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب گورے آبادکاروں کو کاشتکاری کے لیے کالے مزدوروں کی ضرورت پیش آتی — کیونکہ کالے مزدور انہیں انتہائی کم اجرتوں پر مہیا ہو جاتے تھے — تو ان مزدوروں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ جونہی کام سے فارغ ہوں بلا تاخیر کھیتوں سے نکل کر اپنی جھونپڑیوں میں چلے جائیں، جو گوروں کی آبادی سے دور نشیبی جگہوں میں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "احرارِ کینیا — ماؤ ماؤ کی بغاوت" مطبوعہ مصر)

امریکہ میں نیگرو باشندوں کی حالتِ زار | امریکہ کے حالات اس سے بھی زیادہ بدتر اور المناک ہیں۔

ایک طرف تو امریکہ کے دارالحکومت نیویارک میں نصب شدہ مجسمہ آزادی کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے:

"تم اپنے خستہ و کوفتہ اور بدحال عوام کو میرے سپرد کرو جو آزادی کا سانس لینے کے لیے تڑپ رہے ہیں اپنی اس پُر رونق بندرگاہ میں میرے پاس ان لوگوں کو بھیج دو جن کی کوئی جائے پناہ نہیں اور جن کا کوئی وطن نہیں"

لیکن اس علمبردار حریت ملک میں سیاہ فام افراد کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا جارہا ہے اُسے ہم خود بیان کرنے کے بجائے خود انہی کے ایک سرکردہ فرد کی زبان سے نقل کرتے ہیں! امریکی سینیٹ کا معزز ممبر جیمس لکھتا ہے:

"کسی سیاہ فام کے لیے، جو اپنے دل میں سیاسی مساوات کی آرزو رکھتا ہے امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں کاروبار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ملک صرف سفید فام کی ملکیت ہے۔ اور اسے اس کی ملکیت میں رہنا چاہیے۔"

تقریباً ہر میدان میں نیگرو فام، سفید فاموں کے پنجہ تشدد میں گرفتار ہیں۔ مثلاً تعلیمی و ثقافتی میدان میں نیگرو نسل کا حال یہ ہے کہ امریکہ کی ۲۰ ریاستیں ایسی ہیں جن میں کسی کالے رنگ والے کو سفید رنگ والوں کے ساتھ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ریاست میسیسپی (MISSISSIPI) کے دستور میں دفعہ ۲۰ کے تحت درج ہے: "تعلیم و ثقافت کے میدان میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ سفید رنگ والوں کے بچے نیگرو بچوں سے جُدا رکھے جائیں اور دونوں طبقوں کے لیے جداگانہ تعلیم گاہیں ہوں۔" فلوریڈا اسٹیٹ کے قانون میں متعدد ایسی دفعات ملتی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ سیاہ فام طلباء کی کتبِ نصاب سفید فام طلباء کی کتابوں سے الگ ہوں گی۔"

شادی بیاہ کے معاملے میں بھی تقریباً تمام ولایاتِ متحدہ میں یہ پابندی ہے کہ کوئی سفید فام عورت کسی سیاہ فام مرد سے یا سفید فام مرد سیاہ فام عورت سے تعلق زن و شو قائم نہیں کر سکتا اور بعض ریاستوں میں۔ مثلاً ریاست میسیسپی میں۔ از روئے دستور اس طرح کی شادیاں سرے سے ناجائز ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر اُس کالے مرد یا عورت کے ساتھ سفید مرد یا عورت کا تعلق ازدواجی باطل ہے جس کی رگوں میں جاری ہونے والے خون کا آٹھواں حصہ بھی زنگی خون کا ہو۔

کاروبار اور ملازمتوں کے اندر بھی یہی افسوسناک روش پائی جاتی ہے۔ متعدد ریاستوں کا قانون کا خانون

اور فیکٹریوں میں نیگرو ملازموں اور مزدوروں کو گورے ملازموں اور مزدوروں کے دوش بدوش کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہاں تک پابندیاں ہیں کہ جن دروازوں سے گوروں کی آمد و رفت ہو اُن سے نیگرو آمد و رفت کے مجاز نہیں ہیں۔

معاشرتی اور اجتماعی میدان میں اگر دیکھا جائے تو وہاں یہ تشدد اور بہیمیت مزید واشگاف ہو جاتی ہے مثلاً ۱۴ امریکی ریاستوں میں از روئے قانون ٹرینوں میں کالے مسافروں کو سفید مسافروں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے، بلکہ ٹرینوں میں کالے مسافروں کے لیے مخصوص کمپارٹمنٹ ہیں۔ وہ صرف انہی میں سفر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ٹراموں میں، ٹیلیفون کے کمروں میں، ہسپتالوں میں کالوں کے لیے الگ نشستیں ہیں حتیٰ کہ دماغی امراض کے شفاخانوں میں سفید فام پاگلوں اور سیاہ فام پاگلوں کے درمیان امتیاز برتا جاتا ہے۔ سب سے مضحکہ خیز یہ واقعہ ہے کہ واشنگٹن میں کتوں کے ایک قبرستان کے متولی نے ۱۹۴۷ء میں یہ نوٹس جاری کیا کہ اس قبرستان میں ایسے کتوں کو دفن کرنے کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی جن کے مالک نیگرو ہوں گے۔ اس نوٹس کی وجہ اُس نے یہ بیان کی کہ اگرچہ اسے یہ معلوم ہے کہ کتے ایک ہی قبرستان میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو دفن ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن اُسے پتہ چلا ہے کہ کتوں کے سفید مالک اس بات سے سخت برافروختہ ہیں کہ ان کے نازپروردہ کتوں کے ساتھ مرنے کے بعد یہ بدسلوکی کی جائے یعنی سیاہ فام باشندوں کے کتوں کے مساوی درجہ دیا جائے۔“

شمالی امریکہ کے شہروں میں سیاہ فام کا مقام امریکی اربابِ سیاست اس شرمناک انسانی تذلیل پر اکثر یہ کہہ کر پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں کہ مہذب امریکی ریاستوں — یعنی شمالی ریاستوں — میں یہ صورتِ حال نہیں، بلکہ منافرت و کراہیت کا زیادہ زور جنوبی علاقوں میں ہے۔ لیکن واقعات ان عذرات کی صاف تردید کرتے ہیں، شمالی امریکہ کے نام بڑے بڑے شہروں میں سیاہ فام آبادیاں غلیظ اور متعفن محلوں اور بستیوں میں محصور ہیں جہاں ان کے لکڑی کے بنے ہوئے مکانات بوسیدگی کی وجہ سے ہر وقت پیوندِ زمین ہونے کے لیے منتظر رہتے ہیں۔ چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی فوجیں اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ آگ کے شعلے ہر روز کسی نہ کسی مکان کو اپنی لپیٹ میں لیتے رہتے ہیں۔ نیویارک کی ہارلم اسٹریٹ جو نیگرو اسٹریٹ کہلاتی ہے — کا ایک ایک کمرہ ۱۷ اور ۱۸ افراد پر مشتمل ہے۔ ایک بار ایک امریکی جریدے نے اسی اسٹریٹ کے بارے میں لکھا تھا کہ ”اگر ہم ہارلم اسٹریٹ کی گنجان اور تہ بہ تہ آبادی کے انداز کو ایک

اصول فرض کریں اور اُسے ولایاتِ متحدہ کے تمام باشندگان پر منطبق کریں تو ہم بآسانی پورے امریکہ کی آبادی کو نیویارک کے نصف رقبے میں کھپا سکتے ہیں۔ واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس کے سامنے اور ابراہام لنکولن کے اسٹیچو کے زیر سایہ ایک ایسا محلہ موجود ہے جس میں ۲½ لاکھ سیاہ فام نفوس آباد ہیں، یعنی تقریباً واشنگٹن کی کل آبادی کا چوتھا حصہ ہیں۔ لیکن اُن کی زیست میں اور اصطبل کے گھوڑوں کی زیست میں کوئی فرق نہیں ہے۔

معاشرتی اچھوت واشنگٹن ہی میں اس امرِ واقعہ کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی نیگرو سفید فام امریکنوں کے مخصوص ریستورانوں اور ہوٹلوں میں، تھیٹروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں اور شفاخانوں حتیٰ کہ کلیساؤں میں بھی داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایک بار پاناما ری پبلک کا ایک نیگرو واشنگٹن کے کیتھولک گرجا میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی دعا و عبادت میں منہمک تھا کہ ایک پادری تیزی کے ساتھ آیا اور اُس کے ہاتھ میں ایک چٹ دے دی جس میں ایک ایسے کیتھولک گرجا کا پتہ درج تھا جو نیگروں کے لیے مخصوص تھا۔ پادری صاحب سے جب اس اخراج کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ جب شہر میں سیاہ فام کیتھولک کے لیے الگ کلیسا موجود ہیں تو یہ سیاہ فام وہاں جا کر اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے۔" یہ ان پادریوں کی ذہنیت کا حال ہے جو دنیا بھر کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے کہ حضرت یسوع مسیح تمام انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "دورِ جدید میں جمہوریت کا جنازہ" مطبوعہ مصر)۔

امریکی سیاستدانوں کا اعتراف سیاہ فام آبادیوں کا ماحول بیماری، جہالت اور پسماندگی کے کیا رنگ ڈھنگ رکھتا ہے، اس کا اندازہ "امریکن ادارۂ تعلیم و ثقافت" کی ایک شائع شدہ رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رپورٹ پروفیسر براؤن نے ولایاتِ متحدہ کے اکثر حصوں کا دورہ کر کے نیگرو آبادیوں کی معاشرت کا جائزہ لینے کے بعد پیش کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا بیان ہے:

> سڑکوں کی تنگی، راستوں کی روشنی، گندے پانی کی پائپ لائنوں کی حدود اور پولیس کے فرائض کا نقطۂ انتہا، وہ ہوتا ہے جہاں سے شہر کی سیاہ فام آبادی کا آغاز ہوتا ہے۔ اکثر علاقوں میں کوئی ایسا ہسپتال موجود نہیں جس کا دروازہ کالے شخص کے لیے وا ہو سکتا ہو۔ رہی طبی اور نرسنگ سروسز تو یا تو وہ سرے سے مفقود ہیں یا اگر ہیں تو بالکل ناکافی۔ رپورٹ میں سیاہ فام

آبادیوں میں پبلک ہیلتھ کا تناسب بھی اعداد و شمار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں شکاگو اور نیویارک میں سیاہ فام شہریوں میں مرضِ سل کا تناسب سفید فام شہریوں سے ۵ گنا زیادہ تھا۔ نیویارک اور نیوجرسی میں یہ تناسب ۷ گنا زیادہ تھا۔ وضعِ حمل میں مرنے والی سیاہ فام عورتوں کی شرح اموات سفید فام عورتوں کی شرح اموات سے دو گنا تھی۔ جبکہ نیگرو بچوں کی شرح اموات امریکی بچوں کی شرح اموات سے ۷۰ فیصد زیادہ تھی۔ اسی طرح رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکن نیگرو کی اوسط عمر امریکن سفید فام کی اوسط عمر سے پورے دس سال کم ہوتی ہے۔"

یہ ہے وہ رسوا کن اور انسانیت سوز ماحول جس میں امریکہ کے ۱۵ ملین سیاہ فام، جو کل آبادی کا دسواں حصہ بنتے ہیں، زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اب امریکی علمبردارانِ تہذیب کا کیا منہ رہ جاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر آکر گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہیں کہ وہ آزاد دنیا کے بہترین اور امن و سلامتی کے علمبردار ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم امریکی مصنف ہارے ہائیوڈ کی کتاب: آزادی کا نتیجہ کا بھی ایک اقتباس نقل کر دیں تاکہ امریکہ کے دعویٰ حریت کی حقیقت بھی گھر کے بھیدی کے ہاتھوں طشت از بام ہو جائے

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی افریقہ کے ماسوا کسی ملک نے غلامی کو قومی تشدد کا ذریعہ اختیار نہیں کیا۔ جیسا کہ امریکہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ غلامی کی وہ صورت تو ختم ہو چکی ہے جس میں غلاموں کو دوسری اشیاء کی طرح مملوکہ شے سمجھا جاتا تھا، لیکن طبقاتی اور اچھوت نظام کی حیثیت سے ابھی یہ پورے عروج پر ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ جو پوزیشن سفید فام کو حاصل ہے، سیاہ فام کو اس سے فروتر رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ کبھی دیوانوں اور آشفتہ سر لوگوں کے بہکانے پر سیاہ فام نسل کے خاندان کے خاندان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں، اور ذمہ دار حکام منقار زیر پر بیٹھے ہیں یا کبھی ایسے ظالمانہ قوانین صادر کر دیئے جاتے ہیں جن کا مقصد سیاہ فام نسل کا قومی وجود

معدوم کر دینا ہوتا ہے اور کبھی عادات و رسوم کی آڑ میں سیاہ فام نسل کو انتقام کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔"

امریکی ماہر اقتصادیات فکٹر پر لو رقمطراز ہے:۔

"اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ امریکی خانہ جنگی کے دور میں شمالی حصوں کے جو صنعت کار فیڈرل حکومت پر چھا گئے تھے، وہ سیاہ فام اقوام کو آزادی دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ وہ سیاہ فام اقوام کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال کرنے کے لیے ان کے جنوبی آقاؤں کی جگہ خود آقائی کی مسند پر متصرف ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ری پبلکن پارٹی اور جنوبی ریاستوں کی افواج جس پالیسی پر گامزن تھی وہ دراصل ایک پیکٹ کے تحت تھی جو سابق آقاؤں کے ساتھ طے کیا گیا تھا اور جس کا منشا سیاہ فام نسل کے گلے میں ایک نئے طوقِ غلامی کو ڈالنا تھا۔" موصوف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "ملک کے طول و عرض میں خونی اور نسلی عصبیت کا زہر پھیل چکا ہے۔ اور امریکی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اب امریکی قوم سیاہ فام باشندوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ گفتگو کرنے یا ان کی طرف اشارے کنائے کرنے کے لیے ایسے نازیبا الفاظ و کلمات وضع کرنے کی عادی ہو گئی ہے جو نہ صرف استخفاف و تحقیر سے لبریز ہوتے ہیں بلکہ شرافت سے بھی عاری ہوتے ہیں۔"

سیاہ فام ہونے کی سزا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ کولمبیا میں ایک نیگرو نوجوان اپنی ماں کے ساتھ ایک ریڈیو مکینک کے پاس گیا، ان کے پاس ایک مرمت طلب ریڈیو سیٹ تھا جسے وہ مذکورہ ریڈیو مکینک سے منہ مانگی اجرت کے عوض پہلے بھی مرمت کروا چکے تھے۔ لیکن وہ بدستور خراب تھا۔ نیگرو عورت نے ریڈیو مکینک سے کہا "۱۲ ڈالر ادا کرنے کے بعد بھی ریڈیو کا نقص دور نہیں ہوا؟ ریڈیو مکینک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً ان کو نکل جانے کا حکم دے دیا۔ دکان کے ملازم نے اٹھ کر نیگرو عورت کی لاتوں سے ایسی تواضع کی کہ بیچاری منہ کے بل گر پڑی۔ نیگرو نوجوان کو ماں کی اس توہین پر سخت غصہ آیا اس نے ملازم کے ایک گھونسا رسید کیا اور وہ لڑھکتا ہوا دکان کے باہر جا پڑا۔ اتنے میں ہمسایہ دکاندار نے یہ دیکھ کر شور مچا دیا کہ "پکڑ لو، اس بدکار کے بچے کو"۔ چنانچہ آناً فاناً لوگ جمع ہو گئے

اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ "ہم ان دونوں سے انتقام لے کر چھوڑیں گے" امریکیوں کے نزدیک انتقام لینے کی نوعیت یہ ہے کہ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر سیاہ فام کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جائے۔ بالآخر بعض لوگوں کے بیچ بچاؤ سے اس وقت نیگرو وہاں بیٹھے کو وہاں سے نکال کر جیل میں بھیج دیا گیا لیکن عوام کا جوشِ انتقام اس سے سرد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیگرو باشندوں کے محلے پر پل پڑے اور پولیس کی حفاظت کے باوجود فائرنگ اور آتش زدگی کے متعدد حادثات رونما ہو گئے جن میں متعدد سیاہ فام موت کے منہ میں آ گئے اور ایک خاصی تعداد زخمی ہو گئی۔"

سیاہ فام لونڈی اور عمر بن عبدالعزیز اب اسلامی تہذیب کی ایک مثال بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

پہلی صدی ہجری ــــ یعنی ۱۳ سو سال قبل ـ کا واقعہ ہے۔ مصر کی ایک فرتونہ نامی حبشی لونڈی کی طرف سے امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کے پاس فریاد آئی کہ اس کے گھر کی بیرونی دیواریں پست ہیں جس کی وجہ سے اس کی مرغیاں چوری ہوتی رہتی ہیں۔ امیر المومنین نے اُسے پیغام بھیجا کہ میں نے مصر کے گورنر کو حکم دے دیا ہے کہ تمہاری دیوار کو درست کر دے اور تمہارے مکان کو مزید محفوظ کر دے۔ ادھر مصر کے گورنر ایوب بن شرحبیل کے نام یہ فرمان لکھا: "ذی اصبح کی لونڈی فرتونہ نے مجھے لکھا ہے کہ اس کی چار دیواری چھوٹی ہے جس کی وجہ سے اس کی مرغیاں چوری ہو جاتی ہیں۔ فرتونہ نے دیوار کو مضبوط اور اونچا کرنے کی درخواست کی ہے۔ میرا یہ فرمان کو وصول کرتے ہی تو بذاتِ خود فرتونہ کے مکان پر جا اور اس تمام کارروائی کو سرانجام دے۔" ایوب بن شرحبیل کو جب امیر المومنین کا مکتوب ملا، وہ فوراً انتقام جیزہ کی طرف روانہ ہوا اور فرتونہ نامی لونڈی کا مکان تلاش کرنے لگا۔ چنانچہ سعیِ بسیار کے بعد جب اُسے مکان ملا تو دیکھا کہ ایک سیاہ رو اور بدحال عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے فرتونہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی موجودگی میں اس کی دیوار کو بنوایا۔ یہ ہیں اسلامی تہذیب کے خدوخال ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

(بقیہ: ایک ضروری تصریح) ـ نہیں ہوتی کہ لوگ اُسے مانیں یا انکار کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ میں آپ کو اپنی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اصل اقتباس اور مبینہ اقتباس میں جو تفاوت ہے اُسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ مجھ سے بعض مقامات پر کچھ زیادتی ہوئی ہے جس کے لیے میں پھر آپ سے بصد احترام معافی چاہتا ہوں ـــ اخلاص کیش: عبدالحمید صدیقی)

رسائل و مسائل

انکارِ حدیث اور اقرارِ حدیث

سوال: رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے اسوۂ حسنہ کا جو تفصیلی ریکارڈ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اُسکی افادیت و اہمیت کا منکر کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے استفادہ کرنیکے بجائے اس پورے ذخیرے کو دریا بُرد کر دیا جائے البتہ بعض حضرات اپنا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم صرف انہی حدیثوں کو مانتے ہیں جو صحیح ہیں اور حدیث کی صحت کا معیار ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ خلافِ قرآن اور خلافِ عقل نہ ہو۔ ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حیثیت سے رسول اللہ تھے اور دوسری حیثیت سے امیرِ ملت اور مرکزِ ملت تھے۔ رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے آنحضورؐ کا جو اسوہ دائماً واجب الاتباع ہے وہ قرآن کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے اور سنت کا اطلاق اگر کسی شے پر کرنا بھی ہو تو وہ اسی قرآنی اسوۂ رسول پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ماسوا آپ کا جو قول و فعل منقول ہے اُس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ امیرِ ملت اور خلیفۂ وقت کے قول و فعل کی سی ہے۔ امیرِ ملت ہونے کی حیثیت میں آپ کے اوامر و نواہی صرف حینِ حیات آپ کے مامورین (صحابہ کرام) کے لیے واجب الاتباع تھے۔ بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و قضایا کی حیثیت محض ایسے تاریخی نظائر کی ہے، جن کی پابندی اور اطاعت لازم نہیں ہے۔ اصل اور مطلوب اطاعت صرف قرآنی حکومت کے موجود اور حاضر امراء کی ہے اور ان امراء کو یہ حق حاصل ہے کہ چاہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی پیروی کریں اور کرائیں اور چاہیں تو ان میں ردّ و بدل کر کے نئے احکام وضع کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و عمل کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اُس کے صرف عہد نبوی ہی تک واجب الاطاعت ہونے کے حق میں یہ اصحاب مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بشری اور نبوی حیثیتوں میں امتیاز قائم کر کے ارشاد فرمایا تھا کہ بشری حیثیت میں جو اعمال آپ سے ظہور پذیر ہوں ان کی اطاعت لازم نہیں۔ خلفائے راشدین نے بہت سے معاملات میں معمولاتِ نبوی کے خلاف عمل کیا ہے، بالخصوص حضرت عمرؓ نے تو چالیس پچاس فیصلے ایسے نافذ کیے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیے تھے۔ امام ابو حنیفہ کا مسلک بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا بلکہ صحیح احادیث بھی اگر ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ انہیں منسوخ اور ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ احکام عہد نبوی میں قوم عرب کیلیے خاص تھے، دوسروں پر ان کی من و عن تعمیل واجب نہیں ہے۔ یہی نظریہ شاہ ولی اللہ کی جانب بھی منسوب کیا گیا ہے۔

قرآنی فکر کے پیامبروں اور علمبرداروں کا مسلک تو میں نے مختصراً بیان کر دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مسلک کو انکارِ حدیث و سنت پر محمول کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور احکام رسول کو صرف عہدِ رسالت تک واجب الاتباع سمجھنے کا نظریہ اور اس نظریے کا انتساب مذکورہ بالا سلف صالحین کی طرف صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: آپ نے اپنے خط میں جن سوالات کو چھیڑا ہے ان پر مکمل اور تفصیلی بحث ایک مختصر جواب کی شکل میں نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو ایک طویل مضمون، بلکہ ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ الحمدللہ کہ ذی علم اصحاب نے اپنے مستقل مضامین اور تصانیف میں اس ضرورت کو بہت بڑی حد تک پورا بھی کر دیا ہے۔ اس لیے میں صرف یہ کوشش کروں گا کہ آپ کے خط کو سامنے رکھ کر اس سلسلے کی چند اصولی باتیں عرض کر دوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اس مسلک کے قائل ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو قولی اور عملی تعلیمات قرآن سے زائد ہیں ان کی پیروی صرف آپ کی زندگی میں صحابہ کرام پر لازم تھی، ان لوگوں کا اقرارِ حدیث اور انکارِ حدیث برابر ہے۔ یہ لوگ اپنے قائم کردہ معیارات پر جانچ کر اگر کسی حدیث کو صحیح اور قرآن و عقل

کے مطابق قرار دے بھی لیں تو اس کا عملی نتیجہ صرف یہ برآمد ہوگا کہ وہ اس حدیث کو بس صحیح مان کر رہ جائیں گے اور اس بات کو بطور ایک امرِ واقع کے تسلیم کر کے بیٹھ جائیں گے کہ فلاں بات کی نسبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب درست ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح مثلاً ایک شخص بطور امرِ واقع کے مان لے کہ کتاب "سرمایہ" کارل مارکس کی تصنیف ہے یا "ارمغانِ حجاز" کلامِ اقبال ہے۔ باقی رہا ایک شے کو صحیح مان لینے کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کا سوال تو وہ وہاں بھی خارج از بحث ہوگا اور یہاں بھی۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ جس مقام تک یہ حضرات جاسکتے ہیں وہ یہ کہ "مرکزِ ملت" اگر اس حدیث کو قابلِ عمل سمجھ کر اس پر عمل کرنے کرانے کا فیصلہ صادر فرمادے تو اس پر عمل بھی کر لیں گے۔ مگر ایسی حالت میں بھی حدیث پر عامل ہونے کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ یہ قولِ رسولؐ یا عملِ رسولؐ ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہوگی کہ "مرکزِ ملت" نے اسے پاس کر کے سندِ جواز عطا کر دی ہے۔ اگر "مرکزِ ملت" اس حدیث پر خطِ ترمیم یا خطِ تنسیخ پھیر دے تو پھر یہ حضرات بیش از بیش جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ حدیث صحیح کو بھی ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر کے اسی جگہ رکھ دیں گے جہاں تاریخ کے دوسرے ذخیرے رکھے ہیں۔ تاریخ نہ سکندر اور نپولین کی واجب الاتباع ہے نہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی!

میرا خیال یہ ہے کہ اس مسلکِ شریف کے حاملین کے لیے یہ ایک غیر ضروری تکلف ہے کہ وہ حدیث کی صحت اور عدمِ صحت کے لیے نقلی یا عقلی کسوٹیاں فراہم کرنے کرانے کے جھنجھٹ میں پڑیں۔ انہیں تو جم کر ایک ہی موقف اختیار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ جس حدیث پر "قرآنی حکومت" اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دیگی اُس کا چلن ہوگا اور جس حدیث کو وہ اپنے عہد کے حالات اور مصالح کے لحاظ سے ناقابلِ عمل قرار دے دیگی وہ کھوٹے سکے کی طرح ٹکسال باہر ٹھہرادی جائیگی۔ البتہ اگر منشا یہ ہو کہ انکارِ حدیث کے سنگین الزام اور عامۃ المسلمین کی ناراضی سے بچنے کے لئے نیمے دروں نیمے بروں کی پالیسی اختیار کی جائے اور خلطِ مبحث سے کام لے کر زبان سے حدیث کے اقرار اور عمل سے اس کے انکار کا موقف لیا جائے تو بات دوسری ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی اور آپ کے فرامین و قضایا اور آپ کی قولی و عملی ہدایات

صرف عہدِ نبوی تک واجب الاطاعت قرار دینے کے لیے ان اصحاب کی طرف سے رسالت اور امارت کے مابین جس طرح تفریق قائم کی گئی ہے یہ بھی ایک خواہ مخواہ کی مغالطہ آمیزی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے امیر بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی تھے اور متعدد دیگر حیثیات میں بھی آپ مومنین کے ہادی اور رہنما تھے لیکن ذاتِ نبویؐ کی یہ تمام حیثیتیں درحقیقت منصبِ رسالت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے منفک کرنے اور ایک کو دائمی اور دوسری کو عارضی قرار دینے کا نظریہ اور خیال سراسر باطل اور غیر معقول ہے۔ مقامِ رسالت کا ظہور انہی مختلف حیثیات کے پردے میں ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر رسالت کی شان لیے ہوئے ہے اور ہر ایک پر مشکوٰۃ نبوت کے نور کا پرتو پڑا ہوا ہے۔ ان سے الگ کر کے نبوت و رسالت کی حقیقت و ماہیت کا تصور کرنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مختلف حیثیتوں سے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ دراصل فریضۂ رسالت ہی کی ادائیگی کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان سب کا باہم گہرا پیوستہ ذکر بلا امتیاز قرآن میں بھی موجود ہے اور حدیث میں بھی۔ وہاں نہ تو رسالت و امارت کے مابین کوئی خطِ فاصل کھینچا گیا ہے نہ یہ اصول کہیں بیان کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول و فعل قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے بس وہی اسوۂ حسنہ اور سنتِ رسول ہے اور وہی دائماً واجب الاتباع ہے اور قرآن سے باہر اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی کوئی روداد موجود ہو تو اُس پر اسوۂ حسنہ اور سنتِ رسول کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ بس ایک امیر کا قول و فعل ہے جو عہدِ امارت کے ختم ہو جانے کے بعد قابلِ تقلید نہیں ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر صرف قرآن ہی کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے متعدد پہلو ایسے مذکور ہیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعبۂ امارت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اب اگر امارتِ نبوی کے حقوق و واجبات کو منصبِ رسالت سے ممیز کر کے انہیں عارضی اور وقتی قرار دے دیا جائے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ امارت سے متعلق قرآنی اسوۂ حسنہ بھی ابداً قابلِ تقلید نہیں ہے، حالانکہ یہ بات بالکل باطل، لغو اور خود قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے۔ یہ ان مدعیانِ تفریق و امتیاز کے اُس نظریے کے بھی خلاف ہے جس کے

لحاظ سے وہ از راہ کرم قرآن کے اندر جذب شدہ اسوۂ نبوی کو سنتِ رسولؐ کا درجہ دے کر اُسے اپنے لیے قابلِ اتباع قرار دیتے ہیں۔

اب ان مزید دلائل کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جن پر امارت و رسالت کی تفریق کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان میں سے ایک دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ بشری اور نبوی حیثیتوں کے درمیان امتیاز کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بعض امور میں اپنی پیروی سے مستثنیٰ کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ کم از کم اس سلسلے کی بعض احادیث کو صحیح مان کر ان سے "استفادے" کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان احادیث سے اُس نظریے کے حق میں کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جس کی بنا پر امارت و رسالت کے مابین تفریق کر کے ایک کو عارضی اور دوسری کو دائمی قرار دیدیا گیا ہے؟ کیا آنحضورؐ کے بشری خصائص اور فریضۂ ہدایت و امامت کی انجام دہی کے دوران نافذ شدہ احکام و ارشادات کی نوعیت بالکل یکساں ہے؟ بلاشبہ بعض ایسے خصائص بشریہ یا امور عادیہ کا صدور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہوا ہے جن کی پیروی شریعت نے ہم پر لازم قرار نہیں دی لیکن کیا کوئی ہوش مند اور انصاف پسند مسلمان اس استثناء سے یہ کلیہ اخذ کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ہادی، معلم، مربی اور حاکم ہونے کی حیثیت سے عمر بھر جو کارنامہ انجام دیا اس کی پیروی سے بھی ہم آزاد ہیں، حالانکہ اس کی پیروی اور اقتداء کا واضح حکم نہ صرف صحابہ کرامؓ کو بلکہ صراحت کے ساتھ اُن سے بعد میں آنے والوں کو بھی دیا گیا؟[1]

احکامِ نبوی کو عارضی اور ہنگامی ثابت کرنے کے لیے ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ خلفائے راشدین نے بہت سے معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عمل کیا ہے اور اس بارے میں

---

[1] اس نوعیت کے احکام پر مشتمل احادیث بکثرت موجود ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ ستکون من بعدی کذا وکذا (تم میرے بعد ایسے اور ایسے حالات سے دوچار ہو گے، تو تم ایسا اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا)۔ یہ احادیث انہی کتابوں میں موجود ہیں جن میں سے بشری اور نبوی حیثیتوں سے متعلق احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ نہ معلوم اس طرح کی احادیث کی اہمیت و افادیت کے بارے میں کیا رائے ہے؟

حضرت عمرؓ کا حوالہ خاص طور پر دیا گیا ہے۔ مجھے یہاں بھی افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ الزام عائد کرتے وقت پھر وہی حرکت کی گئی ہے کہ واقعات کی غلط اور یک رخی تصویر پیش کر کے جس چیز کو استثناء کا درجہ بھی مشکل سے دیا جا سکتا تھا اُسے قاعدۂ کلیہ کی شکل میں نمایاں کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ بعض اصحابِ علم نے ایسے تمام واقعات کا استقصاء کر کے اور ان کی تفصیلات بیان کر کے اس الزام کی قلعی اچھی طرح کھول دی ہے اور اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ خلفائے راشدین نے سنتِ رسول سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا۔ جن امور کو حضرت عمرؓ یا دیگر خلفائے راشدین کی جدت یا اولیات میں سے شمار کیا گیا ہے، اُن کے بارے میں یا تو کتاب و سنت سے کوئی نص موجود نہ تھی یا اگر تھی تو اس میں اتنی وسعت موجود تھی کہ اُس کی تعمیل میں ایک سے زائد صورتیں اختیار کی جا سکتی تھیں۔

ان واقعات کی صحیح تفصیلات و توجیہات بیان کرنے کے بجائے میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآنی فکر کے پیامبروں سے یہ پوچھیں کہ خلفائے راشدین کی ان مزعومہ ترمیمات کی تلاش میں وہ جن کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں کیا وہاں اس قسم کی روایات بھی ان کی نگاہ سے کبھی گزری ہیں یا نہیں کہ یہی خلفائے راشدین انعقادِ بیعت کے وقت یہ عہد کیا کرتے تھے کہ ہم ہمیشہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے تمسک کریں گے اور خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد ان میں سے ہر ایک نے مجمع عام میں مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ (میری اطاعت اُس وقت تک کرو جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروں اور جب میں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں ہے)۔ ان خلفاء کے سامنے جب بھی کوئی فیصلہ طلب معاملہ آتا تھا تو وہ سب سے پہلے کتاب اللہ اور اس کے بعد اپنے علم کی حد تک سنتِ رسول اللہ سے رجوع کرتے تھے۔ اگر ذاتی علم رہنمائی نہیں کرتا تھا تو پھر اربابِ شوریٰ سے پوچھا جاتا تھا کہ آیا اُن کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ایسا ہے جو اس مسئلے کو حل کر سکے۔ اگر وہاں سے بھی مدد نہیں ملتی تھی تو پھر عام منادی کی جاتی تھی کہ فلاں قضیہ درپیش ہے، کیا اس سے متعلق کسی کے پاس سنت کا کوئی علم موجود ہے؟ اگر کسی کے ہاں فرمانِ رسول مل جاتا تھا تو خلیفہ بے اختیار پکار اٹھتا تھا

کہ الحمد للّٰہ الذی جعل فینا من یحفظ علینا دیننا (خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمارے درمیان ایسا آدمی پیدا کیا ہے جو علوم نبوی کی محافظت کرتا ہے)۔ اس کے ساتھ ہی خلیفہ راشد حسرت بھرے لہجے میں اپنی لاعلمی پر افسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے الہانی الصفق بالاسواق (مجھے بازار کے کاروبار نے غافل رکھا!)۔ بلکہ اگر خلیفۂ وقت کوئی فیصلہ کر بیٹھتے تھے اور بعد میں اس کے خلاف سنتِ رسول سے کوئی شے علم میں آجاتی تھی تو فوراً اپنے فیصلے سے رجوع کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ نادانستہ بھی سنت کی خلاف ورزی سے بال بال بچ گئے۔ وُلاۃ اور قضاۃ اور معلّمین کو یہ واضح ہدایت دے کر مامور کیا جاتا تھا کہ پہلے کتاب و سنت سے مراجعت کرو، اگر وہاں سے نص نہ ملے تو پھر اجتہاد کرو۔

اس طرح کی روایات حدیث، سیرت اور تاریخ کی تمام کتابوں میں بکثرت موجود ہیں اور ایک ایک کتاب میں کئی کئی مرتبہ دہرائی گئی ہیں۔ ان سے منہ موڑ کر اگر کوئی شخص محض اپنے مفید مطلب استثنائی واقعات کو چنتا پھرے تو اُس کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو روز روشن میں نظر آنے والے اور شاہراہ عام پر نصب کردہ سنگ ہائے میل سے تو آنکھیں میچ لے لیکن تنگ و تار کوٹھریوں میں تنکے تلاش کرتا پھرے۔ حق کے طالب گاروں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا کہ پہلے خود اپنی مرضی سے ایک نظریہ گھڑیں، پھر اس کی موافقت میں کہیں سے اگر رائی کا ایک دانہ بھی مل جائے تو اسے پہاڑ بنا کر دکھائیں اور اپنے منشا کے خلاف اگر پہاڑ بھی نظر آئے تو اُس کے وجود ہی کا انکار کر دیں۔ جن لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن کی سند کے بغیر لقمہ توڑنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے انہیں اپنے دعوے کی کچھ تو لاج رکھنی چاہیے!

بہرکیف جو شخص واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے مرض میں مبتلا نہ ہو وہ خلفائے راشدین کی سیرتوں کو دیکھ کر کبھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ یہ خلفا اپنے آپ کو سنتِ رسول کی پیروی سے آزاد یا اس کی خلاف ورزی کا مجاز سمجھتے تھے۔ یہ الزام حضرت عمرؓ کے خلاف خاص طور پر عائد کیا جاتا ہے اور اُن کے چالیس یا پچاس فیصلے اس کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ عہدِ فاروقی کی میعاد تقریباً ساڑھے دس برس تھی اور اس مدت میں حضرت عمرؓ نے بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں، ہزاروں ہی معاملات میں اپنے

لہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

فیصلے صادر فرمائے ہونگے۔ ان میں سے صرف چالیس یا پچاس معاملات ایسے نکلنا جن کے اندر سنتِ نبوی سے بادی النظر میں عدمِ مطابقت دکھائی جا سکے، اوّل تو بجائے خود اس الزام کی کمزوری پر کھلی دلیل ہے، پھر جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ ان مثالوں میں بھی اپنا مدّعا ثابت کرنے کے لیے کیسی کچھ کھینچ تان کی گئی ہے اور جان بوجھ کر اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر یا واقعات کی تحریف کر کے زبردستی اتباعِ سنت کو خلاف ورزیٔ سنت بنایا گیا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ "قرآنی فکر" کے ان علم برداروں کی دیانت پر گھن آنے لگتی ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال کا بطور نمونہ ذکر کیے دیتا ہوں حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے طواف میں کندھا ہلا کر دوڑنا ضروری قرار نہیں دیا تھا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اظہارِ شوکت اور کفار کو مرعوب کرنے کی خاطر ایسا کیا تھا اور غلبۂ اسلام کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اب دیکھیے۔ صحیح احادیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے رَمل (کندھے ہلا کر دوڑنے) کو ترک کرنے کا ارادہ تو کیا تھا کیونکہ بظاہر اس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی تھی مگر مابعد آپ کے ذہن میں دوسرا خیال پیدا ہوا اور آپ نے فرمایا: شَيْءٌ صنعه رسول الله صلی الله علیه وسلم فلا نحب ان نترکه (یہ تو ایسا کام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ پس ہمیں اس کا چھوڑنا پسند نہیں)۔ بخاری، کتاب المناسک میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ، جنہیں بڑی دھوم دھام سے منکرِ حدیث بنایا جاتا ہے، اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ــــ اور یہ وہی کتاب ہے جس سے انکارِ حدیث کی سند فراہم کی جاتی ہے ــــ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ترکِ رَمل کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اس کی علت اب موجود نہ تھی، ثم خشی عمر ان یکون له سبب اٰخر، "پھر عمرؓ ڈر گئے کہ کندھا ہلا کر دوڑنے کا سبب کوئی دوسرا نہ ہو جو اُن پر مخفی ہو۔"

سبحان اللہ! جو عمرؓ سنت کے معاملے میں اتنے محتاط اور چوکنّے تھے کہ دوڑتے ہوئے شانے کی ایک مخصوص حرکت کو بھی تبدیل کرنے سے خائف تھے کہ مبادا شارع علیہ السلام کی مخالفت لازم نہ آئے، اُن کے خلاف سنت کے ترک اور سنت میں ترمیم و تنسیخ کا الزام عائد کیا

جاتا ہے![1]

حضرت عمرؓ اور دیگر خلفائے راشدین کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر ترکِ سنت اور انکارِ حدیث کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے، اُس کا حال بھی یہی ہے۔ حقیقت و صداقت سے اس کا دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس الزام کی بھی علماء کی جانب سے مفصل تردید کی جا چکی ہے۔ میں اس بارے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ کے سلسلے میں جو خدمات سر انجام دی ہیں اور حدیث و سنت کے بارے میں ان کا جو موقف تھا، وہ کوئی تاریخ کا گم شدہ ورق نہیں ہے کہ مؤرخین کی تاریخوں یا شعراء کے خطبات میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے۔ علاوہ ازیں کسی شخص کا مسلک معلوم کرنے کا یہ کوئی صحیح اور معقول طریقہ نہیں ہے کہ وہ شخص خود اور اس کے تلامذہ اور مؤیدین جس طرح اُسے پیش کرتے ہیں اُس سے اعراض کر کے اُس شخص کا مسلک اُن لوگوں سے معلوم کیا جائے جو اس سے مخالفت یا اختلاف کا جذبہ رکھتے ہیں یا اُس کے مسلک کی کما حقہٗ واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ اس میں شک نہیں کہ امام صاحب کے اجتہادات کے ضمن میں حدیث کے ضعف و قوت اور حدیث و قیاس کی کثرت و قلت سے متعلق علمی بحثیں پہلے بھی چلتی رہی ہیں اور شاید آئندہ بھی چلتی رہیں گی لیکن آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اگر انصاف سے کام لے تو اُن پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ منکرِ حدیث تھے اور صحیح حدیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ اس پر عمل کرنے کا زمانہ اب بیت گیا۔ جس امام کے اقوال یہ ہوں کہ " اذا صح الحدیث فھو مذھبی[2]"۔ . . " لولا السنۃ ما فھم احد منا القرآن[3]" . . . . . " لولا الحدیث لقلت بالقیاس[4]"، اور جو امام دیگر

---

[1] ممکن ہے حضرت عمرؓ سے انتقام لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ انہوں نے فتنۂ انکارِ سنت کے خلاف پہلے سے خصوصی طور پر متنبہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ سننِ دارمی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے فرمایا آئندہ کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن میں شبہات پیدا کر کے بحثیں کریں گے فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ "ان جھگڑالو لوگوں پر سنت کے ذریعے سے گرفت کرو کیونکہ اصحابِ سُنن ہی کتاب اللہ کا بہتر علم رکھتے ہیں"۔ [2] جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ [3] اگر سنت نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔ [4] اگر حدیث نہ ہوتی تب میں قیاس سے کام لیتا۔

مذاہب فقہیہ کے برعکس اور قیاس کے بالکل خلاف، نماز کے اندر قہقہہ کو محض اس وجہ سے مفسد وضوء و صلوٰۃ قرار دیتا ہو کہ حدیث میں ایسا ہی وارد ہے، اور جس امام کے مقلّدین کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی تحقیق و تدقیق کا پورا زور اس امر پر صرف کرتے ہوں کہ ہمارے مسلک کے ایک ایک جزئیے کے حق میں دوسرے مذاہب کے بالمقابل اگر قوی تر حدیث نہیں تو کم از کم برابر کی قوی حدیث تو ضرور موجود ہے، اور جو قیاس پر ضعیف حدیث کو بھی ترجیح دینے کے قائل ہوں، ایسے امام کے خلاف انکارِ حدیث کا الزام جڑ دینا ظلمِ عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟

(غلام علی)

پاکستان میں خواتین کا پاکیزہ و اصلاحی ماہنامہ

عفت

اپنی اشاعت کا ۔۔ سال کامیابی کے ساتھ مکمل کرنے کی خوشی میں اپنا

سالنامہ

ماہ نومبر ۱۹۵۸ء میں پیش کر رہا ہے

ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین — اور — شعراء اور ادباء کی منتخب نگارشات کا یہ گلدستہ، مفید و معلوماتی مضامین — دلچسپ اور مقصدی افسانوں — اور — پاکیزہ منظومات پر مشتمل ہوگا

مشتہرین کیلیے خواتین میں اپنی مصنوعات کے تعارف کا یہ قیمتی موقع ہے

سالانہ چندہ — پانچ روپے آٹھ آنے • قیمت فی پرچہ — آٹھ آنے • قیمت خصوصی اشاعت — صرف ایک روپیہ

مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ چندے ہی میں دیا جائیگا

سالنامہ محفوظ طریقہ پر منگانے کے لیے خریدار حضرات [illegible] کے ٹکٹ ارسال فرمائیں

ادارہ خواتین — اچھرہ — لاہور

عزاسمه

اسلام پسند خواتین کا ترجمان و مشیر

ماہنامہ بتول لاہور کا پہلا سالنامہ

ماہ جنوری ۱۹۵۹ میں شائع ہو رہا ہے

ملک کے اس منفرد اور اپنی طرز کے ممتاز نسوانی پرچے کا یہ یادگار نمبر انشاء اللہ اعلیٰ تعمیری صلاحیتوں سے بہرہ ور خواتین اور مرد اہل قلم کی بہترین نگارشات' کو جدید ترین طباعتی حسن کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کریگا۔

دلکش نظمیں ۔ خیال انگیز غزلیں ۔ نفیس اور پاکیزہ افسانے و ڈرامے
لطیف طنز پارے ۔ معلومات افزاء مقالات

نیز عورتوں کے مخصوص معاشرتی فرائض و مسائل سے بھرپور مضامین
اس نمبر کی زینت ہونگے

"بتول" کا سالنامہ

اس حقیقت کی بھرپور آئینہ داری کرے گا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ترقی، عزت و سر بلندی بھی در اصل اسلام ہی کے ضابطۂ حیات کی پیروی میں مضمر ہے اور جدید تہذیب اپنی جھوٹی چمک دمک کے ذریعے عورت کو جس دام فریب میں پھنسانا چاہتی ہے، اس کی حقیقت زمرد کے ایک گلو بند سے زیادہ نہیں ۔ جو اس کی خودی اور آبرو نیز عزت و شرف کا گلا گھونٹنے کے علاوہ اور کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا ا

نیا اور خوبصورت سرورق ۔ اعلیٰ طباعت و کتابت ۔ عمدہ کاغذ ۔
ضخامت ۲۰۰ صفحات ۔ قیمت ۲ روپے

* مستقل خریداروں کو سالنامہ سالانہ چندہ ۵ روپے میں ہی دیا جائیگا *

* مشتہرین حضرات اپنے اشتہارات کے لئے جلد جگہ مخصوص کرا لیں *

ایجنٹ حضرات ابھی سے اس کے آرڈر لے کر مطلع فرمائیں

ناظم ادارہ بتول ۔ ۴ اے ذیلدار پارک ۔ اچھرہ ۔ لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس ۔ لاہور